ممّی خانہ

اور

دوسرے ہیبت ناک افسانے

حجاب امتیاز علی

پبلشرز یونائیٹڈ
چوک انارکلی - لاہور

ایم، عبدالسلام مینجر پبلشرز یونائیٹڈ چوک انارکلی لاہور نے
مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا ——

۱۹۴۵ء

بار اوّل ———————— قیمت ۱۲ عہ

عُنوانات

مہمان داری

مجھے ایک مُدّت سے سمرو کے کھنڈر دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

اتفاق سے ایک دن باتوں باتوں میں مَیں نے اپنے شوق کا ذکر بوڑھے ڈاکٹر گار سے کیا۔ وہ سُنتے ہی بولے: "اتنا اشتیاق ہے تو بھئی وہاں کی سیر کو جاتی کیوں نہیں؟ تمہارے قیام کا انتظام مَیں کئے دیتا ہوں۔ مادام حمرہ بڑی خوشی سے تمہیں اپنا مہمان بنائیں گی۔ کہو تو آج ہی اُنہیں خط لکھ دُوں؟"

"مادام حمرہ کون ہیں؟" مَیں نے سوال کیا۔

بُوڑھے ڈاکٹر گار نے نسوار کی ڈبیا پتلون کی جیب سے نکالی اور اُس پر اُنگلی مارتے ہوئے بولا: "تم مادام حمرہ کو نہیں جانتیں روحی؟ دو سال ہوئے یہ خاتون سمرو سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر کار کے حادثہ میں بُری طرح زخمی ہو گئی تھیں۔ اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں ہماری پارٹی شکار کی غرض سے نکلی ہوئی تھی۔ خیمے قریب ہی لگے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ شہر دُور تھا۔ ایک مَیں ہی

وہاں ڈاکٹر تھا۔ اللہ نے وقت پر مجھے توفیق دی اور میں اس بچاری خاتون کو اپنے خیمے میں اٹھا لایا۔ چوٹیں سخت آئی تھیں، مگر چار دن کی تیمارداری اور علاج نے خطرے سے باہر کر دیا۔ اور میں نے انہیں اپنی کار میں بٹھا کر اُن کے گھر پہنچا دیا۔ وہ دن، اور آج کا دن، ——— ہمیشہ اُن کا اصرار رہا کہ میں کچھ دن کو اُن کے ہاں جاؤں۔ اور اُن کا مہمان رہوں۔ مگر باوجود اس بچاری کے اس شدید اصرار کے میں اُدھر اب تک نہ جا سکا، نہ کھنڈروں کی سیر کے لئے وقت نکال سکا۔ بیماروں کی خدمت سے جو وقت بچتا ہے، وہ مطالعہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اب یہ موقع اچھا پیدا ہو گیا۔ اپنی بجائے میں تمہیں بھیج دوں گا۔ انہیں خوشی ہوگی۔ تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی۔"

یہ سُن کر میں بولی۔" واقعی، موقع تو اچھا ہے۔ مگر ڈاکٹر! اکیلی میں نہیں جاتی۔ بخدا مجھے لُطف نہ آئے گا۔ تم بھی ساتھ چلو۔"

ڈاکٹر نے اپنے قدیم انداز میں صاف انکار کر دیا۔" نہ بیٹی، میرا جی نہیں چاہتا۔ کون سوٹ کیس بھرے اور سفر کی زحمت اُٹھائے۔"

جسوتی برآمدے کے سرے پر بیٹھی میوہ کھا رہی تھی۔ یہ سُن کر وہیں سے بولی۔" سوٹ کیس میں بھر دوں گی پیارے گارتی۔ آپ ضرور چلیں۔" جسوتی بچپن سے بوڑھے ڈاکٹر گار کو گارتی گارتی کہنے کی عادی ہے۔

ڈاکٹر گار نے تھوڑی دیر کے غور کے بعد اپنی عادت کے مطابق ارادہ بدل ڈالا۔ بولا "تم لوگوں کی فرمائش ٹالتے ہوئے بھی طبیعت آزردہ ہوتی ہے۔ تو پھر جسوتی! میرا سوٹ کیس تم کو بھرنا ہوگا ——— اور میری نسوار کی پڑیوں کی دیکھ بھال روحی تم کرو۔"

بوڑھے ڈاکٹر کی اسی ایک گندی عادت سے مجھے نفرت ہے۔ مجھے نسوار کو چھونے سے بھی گھن آتی ہے۔ مگر کیا کرتی۔ اس وقت مطلب اپنا تھا۔ ناچار وعدہ کر لیا کہ نسوار کی پڑیوں کا اہتمام میں کر لوں گی۔

ڈاکٹر گار نے اسی وقت مادام حمرہ کو خط لکھ دیا کہ ہفتہ عشرہ میں ہم لوگوں سمیت وہاں پہنچ رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر کے پاس بعض کیس ایسے اہم آتے رہے کہ خط لکھنے کے پندرہ دن بعد ہم اپنا سفر شروع کر سکے۔

اس روز میں، میری محبوب اکلوتی سہیلی جسوتی اور ڈاکٹر گار ہم تینوں ڈاکٹر کی چھوٹی سی سفری کار میں چل پڑے۔ دن کی گرمی سے بچنے کے لئے رات کا کھانا کھا کر سفر شروع کیا گیا۔ پروگرام یہ تھا کہ سمرو کے راستے میں رات مادام حمرہ کے ہاں بسر کر کے ان کی خوشی پوری کریں۔ اور دوسری صبح سمرو کے کھنڈروں میں پہنچ جائیں۔ یہ خبر نہ تھی کہ یہ رات زندگی کی نہایت خوفناک راتوں میں سے ایک ہوگی ——— مالک کی پناہ!

مادسٹی کی تپتی ہوئی چاندنی رات تھی۔ ہماری ننھی سی "بنٹ لے" ویران سڑک پر کسی تیز رفتار کیڑے کی طرح چلی جا رہی تھی۔ نو بج چکے تھے خیال تھا کہ بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ہم مادام حمرہ کے ہاں پہنچ جائیں گے۔ سڑک پر کوئی راہگیر نہ تھا، زرد چاند موسم گرما کے شفاف آسمان پر دم بخود تھا۔ تاڑ کے فلک بوس چھتری نما درخت رات کی فسوں کاری سے مبہوت کھڑے تھے۔

جسونتی کار چلا رہی تھی۔ میں اس کے پہلو میں بیٹھی ٹافی کھا رہی تھی۔ بوڑھا ڈاکٹر بجھا ہوا سگار منہ میں دبائے غنودگی کے عالم میں پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔ غنودگی سے چونکتا تو مزے میں آ کر عمر خیام کی کوئی شوخ رباعی اپنی موٹی غیر شاعرانہ آواز میں گا دیتا۔ یہ اس کی مخصوص عادتوں میں سے ایک عادت تھی۔

دلفریب چاندنی تھی اور خوابناک سماں۔ دفعتہً جسونتی نے کار کھڑی کر دی۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے چاکولیٹ کا ایک ٹکڑا نگلتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی "کوئی خرابی روحی!" اور پھر سیٹ سے اتر کر انجن کھول کر دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ "نا ممکن! اچھا ٹھیرو۔ میں دیکھتی ہوں" یہ کہہ کر میں نے اپنا دستی بٹوہ ڈاکٹر کار کی گود میں پھینک دیا۔ اور خود انجن کو دیکھنے لگی۔ آدھے

گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ہم نے مایوس ہو کر ایک دوسرے کو تکا۔

"اب کیا ہوگا روحی؟" جسوتی نے کھسیانے لہجہ میں پوچھا۔

اُسی وقت تاڑ کے دیو قد درخت پر تہذیب و تمدن سے نا آشنا صحرائی اُلّو نے ایک وحشیانہ چیخ ماری۔ بھلا جسوتی کے کان جو ستار کی موسیقی اور محبت کی شیریں سرگوشیوں کے عادی تھے۔ اُلّو کی اِس زیادتی کی تاب کب لا سکتے تھے؟ وہ مارے خوف کے مجھ سے چمٹ گئی۔ لیکن میں تو غیر آباد زمینوں اور پہاڑی جیسے دشوار گزار پہاڑوں کی سیاحت کی عادی ہوں۔ اُس کی بُزدلی پر اس کو ہمت دلائی۔

اتنے میں بوڑھا ڈاکٹر گار حافظ کا ایک عشقیہ شعر پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور پوچھنے لگا: "کیا ہم پہنچ گئے؟"

کچھ دیر بعد پریشانی کے عالم میں ہم تینوں کار سے نیچے اُتر آئے۔ اور سراسیمگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

رات، زیادہ گہری ہوتی چلی جاتی تھی۔ چاند کی زرد روشنی میں رات کا کوئی پرند اپنے بڑے بڑے بازو پھیلائے کسی سمت اُڑتا تو ہم کسی راہ گیر یا گاڑیبان کے دھوکے میں اُسی سمت تکنے لگتے۔

بہت دیر بعد دُور سے بغیر چھت کے دیہاتی وضع کی ایک مضحکہ انگیز گاڑی

آتی ہوئی نظر آئی۔

جستوتی نے اُسے دیکھ کر غمگین لہجہ میں کہا ”اگر ہم دیر میں پہنچے، تو وہ سو چکی ہوں گی۔ اِس لئے اسی گاڑی میں چلے چلو۔“

گاڑی سڑک کے کنارے بے فکری سے جیسے چہل قدمی کرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر گار نے دُور سے آواز دی ”بڑے میاں! ایوب محلہ میں ”عشرت خانہ“ نامی کوٹھی تک ہمیں پہنچا دو گے؟“

گاڑی بان نے بغیر ہماری طرف دیکھے دیہاتیوں کے سے اکھڑ لہجہ میں جواب دیا ”نہیں بارہ بج گئے ہیں۔ دیر ہو گئی ہے۔“

یہ بدتہذیب اور ٹکا سا جواب سُن کر بہت ہی غصّہ آیا۔ ضبط کر کے مَیں اور جستوتی اس کے پاس گئیں۔ وہ ہمارے بیش قیمت زرّین لباس اور باوقار چہرے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔

”یہ لو ——— “ مَیں نے جاتے ہی چاندی کا ایک چمکدار سکہ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اور بولی ”اب ہمیں جلدی سے ”عشرت خانہ“ تک پہنچا دو۔“

وہ مرعوب ہو گیا اور مؤدب لہجہ میں بولا ”سوار ہو جائیے حضور، دو گھنٹہ میں پہنچا دوں گا۔“

گاڑی کے پائیدان پر قدم رکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ گاڑی سر پر آرہی ہے اس لئے فوراً میں نے اس کا کنارہ تھام لیا۔ جسونتی نے اس کے پہیئے کو مضبوطی سے پکڑ کر گاڑی پر قدم رکھا۔ غرض ہم تینوں چڑھ کر بیٹھ گئے۔

اب گاڑی چلی جارہی تھی۔ آہستہ آہستہ، جیسے کسی جاں بلب مریض کا سانس چل رہا ہو۔ چاند زرد پڑ گیا تھا۔ ہواؤں میں خوفناک سرسراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

بوڑھا ڈاکٹر گار گاڑی کے ہچکولوں سے ناخوش اور چڑچڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

ہم دونوں گرمی سے نڈھال ہاتھوں میں خس کی زریں پنکھیاں لئے جن کی ڈنڈیاں خوشبودار صندل کی لکڑی کی تھیں، بار بار بے کلی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ آہ! اللہ وہ گرم اور ویران چاندنی رات! سانس آگ کے شعلوں کی طرح ناک سے نکلتا تھا۔ زبان سوکھے پتے کی طرح خشک تھی۔ جسونتی رہ رہ کر اپنی پری کی وضع کی چھوٹی سی نقرئی صراحی سے پانی انڈیل انڈیل کر پی رہی تھی۔ مشرقی ممالک کی یہ وہی گرم رات تھی جس کے متعلق ہمارے ان ایشیائی ممالک میں مشہور ہے کہ سبز چشم پریاں بھی اپنی آبی دنیا سے باہر نکل آتی ہیں

دور سے ایک سفید شاندار عمارت نظر آنے لگی۔ پھر یک لخت بوڑھا ڈاکٹر گار گاڑی بان پر اور میں جسونتی پر جا پڑی۔ اور اس طرح ہماری ننھی انجیر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ عشرت خانے کے شاندار پھاٹک میں مڑ گئی۔

مَیں نے گریہ آمیز لہجے میں کہا۔" ایسی بھدّی گاڑی میں اپنے میزبان کے سامنے جاتے ہُوئے مَیں تو زمین میں گڑ جاؤں گی۔"

اِس پر بوڑھے ڈاکٹر گار نے کہا۔" مگر رُوحی! اس میں شرم کی کیا بات؟ وُہ کیا سمجھ نہ جائیں گی کہ مجبوری کو اس گاڑی میں سوار ہونا پڑا ہوگا۔"

جسوتی نے کہا۔" نہ نہ جتنی جلدی ہو سکے اس کو واپس کر دو۔"

چاندنی کی سفید دھاریاں خوش قطع اور تنگ روشوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ہماری گاڑی صدر دروازے پر جا کر رُک گئی۔ ہم نے فوراً اُسے واپس کر دیا۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔" یہاں کی دُنیا تو خواب میں ملفوف نظر آتی ہے۔ چوکیدار کا بھی پتہ نہیں۔"

جسوتی نے کہا۔" کون جانے مادام حمزہ یہاں ہیں بھی یا نہیں۔"

ڈاکٹر کہنے لگا۔" ہوں گی کیوں نہیں؟ اُنھوں نے میرے خط کا جواب دیا تھا کہ مَیں دلی اشتیاق سے آپ سب کی آمد کی منتظر رہوں گی۔"

ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلے احتیاط سے، آہستہ آہستہ۔ پھر کچھ دیر بعد زور زور سے۔ مکان کا طواف کیا۔ نوکروں کو پکارا۔ چوکیدار کو آوازیں دیں۔ غرض جتنی کوششیں ہو سکتی تھیں، کر لیں۔ مگر زرد چاندنی میں سفید مرمریں محرابوں والا عالی شان محل خاموش کھڑا رہا۔ دسیع برآمدوں میں سب لمبے لمبے

ستونوں کا عکس چاندنی میں ترچھا پڑ رہا تھا۔ چمبیلی کی بیل میں جھینگر اپنا نغمۂ تنہائی الاپ رہا تھا۔

جب مایوس ہو کر ہم لوگ زینے سے اُترنے لگے تو اچانک اندر کسی کمرے سے ایک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے دیا سلائی جلائی ہو۔

ڈاکٹر گارنے چونک کر کہا "ٹھیرو۔ میرا خیال ہے کہ کوئی جاگ اُٹھا۔"

ہم تینوں پھر زینے طے کر کے دروازے کے پاس اِس اُمید میں جا کھڑے ہوئے کہ اب کھلتا ہے اور اب کھلتا ہے۔ اندر سے کبھی کبھی کوئی خفیف سی آواز آ جاتی تھی۔ پانچ منٹ اسی حالت میں گزر گئے۔ ہم بند دروازے پر نظریں گاڑے کھڑے رہے۔

آخر ڈاکٹر نے حیران ہو کر کہا "یہ کیا بات ہے؟"

مَیں نے شیشوں میں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ وہاں سوائے تاریکی کے کچھ نہ تھا۔

ڈاکٹر بیزار ہو کر چلّایا "ارے بھئی! یہاں کوئی ہے بھی؟"

اُس کے چلّانے کا اثر یہ ہوا کہ اندر پھر کچھ گڑبڑ سی ہونے لگی۔ دو منٹ بعد یکایک دروازہ اس زور سے کھلا کہ ہماری تو آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کا کھلنا تھا کہ تیز و تند ہوا کا ایک سرد جھونکا اچانک ہمارے گرم چہروں سے یوں آ کر

لگا جیسے کسی نے تھپڑ مارا ہو۔ میری تو آنکھیں بند ہو گئیں اور ساتھ ہی ہم تینوں کھڑے کھڑے کانپ سے گئے۔ لیکن دروازہ کے سامنے موجود کوئی نہ تھا

ڈاکٹر گار حیران اور پریشان ہو کر بولا۔" یہ دروازہ کھولا کس نے ؟"

——— اندر کی ویران تاریکی میں داخل ہونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک قدم اندر رکھا تھا کہ جسونتی نے اُسے روک دیا۔ بیزار ہو کر ہم نے پھر باغ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ یک لخت پھر اندر کے کسی دروازے کے پٹ سے کھلنے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی سرد اور تُند ہوا کا جھونکا ایک بار پھر ہم تک پہنچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تاریکی میں ایک ہلکی سی روشنی نظر آنے لگی۔ جو بتدریج موم بتی میں تبدیل ہو گئی۔ ہم نے نگاہ موم بتی سے ذرا اُوپر کو اٹھائی تو اٹھائیس اُنتیس سالہ ایک حسین و دلفریب خاتون نظر آئی جس نے نہایت سادہ اور سفید لمبے لمبے لرزاں دامنوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ موم بتی اُس کے ہاتھ میں تھی۔

ڈاکٹر گار کو دیکھ کر وُہ مسکرائی اور سر جھکایا۔

"مزاج شریف مادام حمرہ ——— یہ دونوں لڑکیاں میری بیٹیاں ہیں انہیں کا ذکر میں نے خط میں کیا تھا۔"

خاتون حمرہ نے نہایت دلکش انداز میں ہماری طرف دیکھ کر خیر مقدم کے

طور پر سر جھکایا۔

پھر ایک لمحہ بعد بغیر کوئی بات کئے انہوں نے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے بلایا۔ اور روشنی دکھاتے ہوئے خود سامنے چلنے لگیں۔ ایک بل کھائے ہوئے ناگ کے پھن پر موم بتی جل رہی تھی۔ ہوا سے ان کے سفید لمبے لمبے دامن ان کے پیچھے دُور دُور تک لہرا رہے تھے۔ چال ایسی تھی جیسے کوئی پری ہوا میں تیر رہی ہو۔ سیاہ بال سفید ریشمی چادر کے نیچے ہوا کی شوخیوں سے لہرا رہے تھے۔ چہرے پر حوروں کی مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت جسوتی نے سرگوشی کی "روحی! یہاں کیسی خنک ہوا چل رہی ہے۔ باہر تو سڑکوں پر لو کی تکلیف دہ لپٹوں سے ہمارے چہرے گرم ہو رہے تھے!"

جسوتی کا فقرہ ختم ہوا ہی تھا۔ کہ ہم ایک عالی شان ہال میں پہنچے جہاں ایک سیاہ لمبی اور پالش سے چمکتی ہوئی چمکدار میز پر انواع و اقسام کے پھل برگ نما نقرئی طشتوں میں سجے ہوئے تھے۔ دل کی شکل کی ننھی ننھی کٹوریوں میں شربت رکھا ہوا تھا۔ میز کے اُوپر چھت میں کنول کے پھولوں کی وضع کے فانوس آویزاں تھے۔ دروازوں پر ارغوانی رنگ کے زرین پردے لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر کسی قدیم جنگِ چین کے مناظر لٹک رہے تھے۔

مادام حمرہ نے اپنی سانپ کی شکل کا شمع دان میز پر رکھ دیا۔ اور خود سر

والی میز پر بیٹھ گئیں۔

"لیکن!" ڈاکٹر گار نے کہا "میری پیاری مادام ——— رات کے ——— دو بجے ایسی لذیذ میز سے کوئی کس طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے؛ اس وقت تو ایک نرم آرام دہ بستر عنایت ہو جائے تو بڑی مہربانی ہو!"

یہ سنتے ہی مادام حمرہ بغیر کسی قسم کا کوئی لفظ منہ سے نکالے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کھانے کے لئے مطلق اصرار نہ کیا۔ اپنا وہی ناگ کی وضع کا شمع دان اٹھا لیا۔ اور مسکرا کر گردن کے اشارے سے ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔

ایک پُر تکلف خواب گاہ میں ہماری مدھم روشنیوں کے نیچے نفیس اور رنگین ریشمی بستر بچھے ہوئے تھے لے گئیں۔ یہاں پہنچ کر سر کے اشارے سے ہمیں شب بخیر کہا۔ اور چپ چاپ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اسی طرح باہر چلی گئیں۔

میں ایک کمزور دل کی وہمی عورت ہوں۔ اپنی میزبان کی ان حرکات نے میرا خون خشک کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرہ سے باہر جاتے ہی میں نے ڈاکٹر گار کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "یہ بات کیوں نہیں کرتیں؟"

گار بولا "میں خود حیران ہوں۔ نہ جانے کیا معاملہ ہے؟"

"یہاں سے بھاگ چلو ڈاکٹر!" میں نے بیزار لہجہ میں کہا۔

جسونتی بولی "ان کی کیسی میٹھی شکل ہے۔ پر کہیں گونگی تو نہیں؟"

ڈاکٹر گار نے کہا "نہیں بیٹی! نہیں! وہ بے حد باتونی ہیں"

میں سوچتے ہوئے بولی "باوجود ان کے حسن کے انہیں دیکھ کر مجھے دہشت سی محسوس ہوتی ہے"

ڈاکٹر گار اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جسوتی اور میں اس راز کو سلجھانے کی کوشش کرتی ہوئی کوئی تین بجے کے قریب اپنے اپنے پلنگوں پر لیٹ گئیں۔

صبح کی عبادت کے وقت عادتاً میری آنکھ کھل گئی۔ پروگرام کے مطابق آٹھ بجے ہمیں ہمرو کے کھنڈروں کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اسلئے میں نے جسوتی کو بھی جگا دیا۔ ہم دونوں نے نماز پڑھی۔ صبح گرم اور خوشگوار تھی۔ نماز کے بعد سامنے چمپی کی بیلوں میں بیٹھ کر بہت دیر چائے کا انتظار کیا۔

مگر جب مایوسی ہوئی تو میں ڈاکٹر گار کے کمرے میں گئی۔ اور بولی۔ "ڈاکٹر! ابھی تک سو رہے ہو؟"

وہ بولے "چائے کے انتظار میں پڑا ہوں روتی! چلئے آ جائیے تو اٹھوں۔ ذری وہ نسوار کی ڈبیا پکڑا دینا۔ شکریہ!"

نو بج گئے اور کسی نے خبر نہ لی۔ تو میں نے کہا "چلئے ڈاکٹر ذرا باہر

نکل کر دیکھیں، چائے یا کوئی خادمہ کیوں نہیں آتی۔؟"

ڈاکٹر گار نے جلدی جلدی کپڑے پہن لئے۔ ہم تینوں وسیع برآمدے سے گزر کر بڑے ہال میں آئے۔ تمام دروازے بند تھے۔ ہر طرف سناٹا اور ویرانی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر پر گرد تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کوٹھی کئی روز سے بند پڑی ہے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے کھنکھار کر آہٹ کر کے ایک ایک کمرے کو کھولا۔ لیکن ہر کمرہ خالی تھا۔ ہر کمرے کے سامان کی یہ حالت تھی جیسے برتا نہیں جاتا۔ سنوار کر رکھ دیا گیا ہے۔

ساری کوٹھی دیکھ ڈالی۔ اس میں کہیں کوئی متنفس نہ تھا۔ ہمارے دلوں پر دہشت ایک بوجھ کی طرح بیٹھنے لگی۔ پریشان ہو کر باہر باغ میں نکل آئے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ یہ راتوں رات کیا ہو گیا ——؟ نوکر کدھر ہیں؟ مادام حمزہ کہاں غائب ہو گئیں۔؟

دس بجنے آ گئے۔ ہم پریشانی کے عالم میں اس ویران گھر کے زینے پر کھڑے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں؟ اتنے میں دیکھا کہ بوڑھا ملازم باغ سے ہو کر اندر آیا۔ اور چپ چاپ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر اس نے فرنیچر نکال نکال کر باہر رکھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زور زور سے روتا بھی جا رہا تھا۔

ہم لوگ تیزی سے اُس کی طرف گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹک سا گیا اور پھر حیران ہو کر ہمارا مُنہ تکنے لگا۔

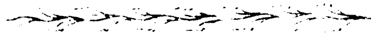
ڈاکٹر گار نے پوچھا۔ "مادام حمزہ کہاں ہے؟"

بُوڑھا متعجب ہو کر دیوانوں کی طرح ڈاکٹر کا مُنہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر گار نے پھر کہا۔ "ہم اُن کے مہمان ہیں۔ مادام حمزہ کہاں گئیں؟"

بوڑھے نے حیران ہو کر کہا۔ "مادام حمزہ؟ ——— آہ حضور! بیگم صاحبہ کو تو سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اُن کے انتقال کو آج پورے دس دن ہو گئے۔ آج گھر کا سامان نیلام ہونے والا ہے۔"

یہ سُنتے ہی میں نے جسم میں ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ رات کا وہ پُر اسرار سرد ہوا کا جھونکا، پھر ایک دفعہ مجھے قریب محسوس ہونے لگا اور میں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگی۔ اس کے بعد مجھے مطلق یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا۔



ممی خانے میں ایک رات

اُس شب میں بڑی دیر تک اپنی تجربہ گاہ میں مُردوں کی چیرپھاڑ میں مصروف رہا۔

رات بہت گرم اور بے حد ویران تھی۔ لیبارٹری کے دریچوں کے باہر اندھیرا جیسے تکان سے نڈھال ہو کر لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ نہ آسمان پر کہیں چاند تھا نہ زمین پر کسی قسم کی آواز۔ دُور دُور تک تاریکی اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

میں اپنے لاشوں کے کمرے میں جسے میں اپنا ممی خانہ کہا کرتا تھا اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ایک عجیب مُردے کے پوسٹ مارٹم میں مشغول تھا۔ میں ہمیشہ رات کے سنسان گھنٹے مُردوں کی چیرپھاڑ میں بسر کرنے کا عادی ہوں۔

جس سنہ کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس زمانے میں شہر میں وبا اس

شدت کی پھیلی تھی کہ الامان الحفیظ! ہر اِک کا دل مٹھی میں تھا۔ صبح جو آدمی ہنستا بولتا تندرست اُٹھتا، وہ شام تک قبر کی آغوش میں جا لیٹتا۔ صبح سے شام کرنا اور رات سے صبح کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

مجھے ہمیشہ سے مُردوں کی چیر پھاڑ سے دلچسپی رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہیضے کی وبا کے زمانے میں ہیضے کے مُردے کس بے دردی سے پھینک دیئے جاتے ہیں! اُس زمانے میں مجھے اپنے تجربات کے لئے لاشیں غیر معمولی کثرت سے دستیاب ہو رہی تھیں۔

جس یادگار رات کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس رات میں اپنی تجربہ گاہ میں تھا۔ ممی خانہ بڑے بڑے برقی لمپوں سے جگمگا رہا تھا۔ سامنے نشتر اور دوسرے اوزار غول بیابانی کی طرح چمک رہے تھے۔ کمرہ جراثیم کش دواؤں کی لپٹوں سے پُر تھا۔ کمرے کے درمیان عین برقی چراغ کے نیچے میز پر ایک لاش پڑی تھی۔ میں اس کے چیرنے میں مصروف تھا اور جسم انسانی کی اِک اِک چیز کو اسی نگاہِ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنے کسی محبوب مصنّف کی دلآویز کتاب کا اِک اِک ورق اُلٹ کر نہایت غور سے دیکھ رہا ہو۔

بائیں کے رُخ اندھے شیشوں کے دریچے ہوا کے لئے کھول دیئے

گئے تھے ۔ رات واقعی بے حد گرم اور نہایت ویران تھی! دریچوں سے باہر ناشپاتی اور املی کے منحوس اندھیرے درختوں پر شاید گوشت کی بُو سے بیتاب ہو کر گدھ اور اُلو آ بیٹھے تھے ۔ اور تاریکی میں بار بار اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے ۔ اُن کی بے قراری اور بے تابی میری مصروفیت میں بار بار مخل ہو کر مجھے پریشان کر رہی تھی ۔

مَیں نے بیزار ہو کر اپنے اسسٹنٹ سے کہا "منبر! دریچہ لگا دو، ان منحوس مُردار خور پرندوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

ابھی میرا جُملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک بڑا سا اُلّو اپنے بوجھل پروں سے جیسے تاریکی میں تیرتا ہوا کمرے میں گھس آیا ۔ اور میرے سر کے اُوپر دائرے کی صُورت میں گھومنے لگا ۔ مَیں لاش پر جُھکا ہوا تھا ۔ مَیں نے پریشان ہو کر سر اُوپر کو اُٹھایا اور نشتر ہاتھ میں رکھ کر ایک وحشیانہ انداز میں ہاتھ ہلانے لگا ۔ لیکن اُلو میرے غصّے اور پریشانی سے بے نیاز اپنے طواف میں مصروف رہا ۔ طیش کی اِک لہر سے میری کنپٹیاں گرم ہو گئیں ۔ مَیں نے کہا "نحس چڑیا! یہ اِس طرح نہیں جائے گی ۔" یہ کہتے ہوئے مَیں نے ایک تیز چاقو اُٹھا کر اس کی طرف ہوا میں پھینکا ۔ اتفاقاً وہ سیدھا اُس کی آنکھ میں جا لگا ۔ اور اُلو ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پھڑپھڑا کر دریچے

سے باہر نکل گیا اور رات کی اتھاہ تاریکی میں جذب ہو گیا۔

مَیں صبح تک اپنے دلچسپ کام میں نہایت اطمینان سے مصروف رہا کوئی چھ بجے کے قریب ممی خانے سے تھکا ماندہ باہر نکلا اور اپنے کمرے میں گیا۔ چائے کی ایک پیالی پی اور بستر پر پڑتے ہی غافل ہو گیا۔

۲

مَیں دن بھر سوتا رہا۔

میری رُوح ممی خانوں کا گشت لگا رہی تھی۔ ڈراؤنے اور ہیبت ناک خواب دیکھے۔ لاشوں کو چلتے پھرتے کبھی کُودتے پھاندتے دیکھا۔ کبھی کفن میں لپٹے ہوئے مجسموں کو مصروفِ رقص دیکھا۔ لاشوں اور مُردہ جسموں سے میری پُرانی دوستی تھی۔ اس لئے مَیں نے خواب میں بھی اُن کا خیر مقدم کیا حریص نظروں سے اُن کی رگ رگ کو تکتا رہا کہ موقع ملے تو اس جگہ اپنا نیزہ چاقو بھونک دُوں۔

شام کے وقت جب بیداری کی سرحد کی مدھم آوازیں خواب کی دُنیا میں رفتہ رفتہ نفوذ کر رہی تھیں تو اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی اِس زور سے بجی کہ مَیں نیند میں چونک پڑا۔ مست نیند اور شیریں غنودگی یک لخت اُتر گئی۔ ڈراؤنے خواب میرا مضحکہ اُڑاتے ہوئے غائب ہو گئے۔ اور مَیں

لاشوں کی دُنیا سے جیتے جاگتے انسانوں کی دُنیا میں پہنچ گیا۔

مریضوں کے ٹیلیفون ڈاکٹروں کو دم نہیں لینے دیتے۔ میں ان کا عادی تھا۔ اِس لئے اطمینان سے سگریٹ کیس کھول کر سگریٹ جلایا ڈریسنگ گون پہنا اور آہستہ آہستہ ٹیلی فون کی ختم نہ ہونے والی گھنٹی تک پہنچا۔

"ڈاکٹر زبیری گھر پر ہیں؟" کوئی صاحب عجیب گول مول سی آواز میں پوچھ رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے مُنہ میں ڈبل روٹی ٹھونس رکھی ہو۔

"جی۔ مَیں ڈاکٹر زبیری بول رہا ہوں"

"نمبر ۷، اندھی باولی پر آج رات گیارہ بجے کے قریب ایک مریض سے ملئے۔ مریض آپ کا بے چینی سے منتظر ہوگا۔ پتہ اپنی یادداشت کی کتاب میں لکھ لیجئے۔ نمبر ۷، اندھی باولی"۔

مَیں کچھ سوچ کر بولا۔" مگر ذرا ٹھہریئے صاحب —— آج تو میرا اِک اَور ——"

پھر آواز آئی۔" آپ کو ملنا ہوگا۔ مریض آپ کا منتظر ہوگا۔ نمبر ۷، اندھی باولی۔"
ٹیلی فون بند ہوگیا۔ اور لامحالہ مجھے اپنی یادداشت میں رات کا اپوئنٹ منٹ لکھنا پڑا۔

گرمی کے دن تھے۔ سات نو بج ہی رہے تھے۔ رات ہونے میں کیا دیر تھی؟ جلد جلد میں نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ صبح سے بھوکا تھا۔ اِس لئے ایک طویل اور مفصّل کھانا کھایا اور ایک مزے دار سگریٹ ہونٹوں میں اٹکا کر اپنا بیگ اُٹھایا اور ایک کرائے کی چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اور نمبر ۷ اندھی باولی کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاڑی بان حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔" اندھی باولی! مگر میرا تو خیال ہے حضور۔ وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بارہ سال سے کرائے کی گاڑی چلاتا ہوں۔ شہر کے چپّے چپّے میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہ سڑک شہر سے بہت دُور ندی کے کنارے جو قبرستان ہے اُس سے لگی ہوئی ہے۔ پہلے وہاں اینٹوں کا اِک آوا تھا۔ مگر میرا خیال ہے اب، وہ بھی اُٹھ چکا ہے۔"

میں ہمیشہ ملازموں اور کمینہ لوگوں سے ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی ہوں۔ طبعاً سخت آدمی ہوں۔ چنانچہ میں نے کہا" احمق! تمہیں اس سے کیا؟ چلو ہم جہاں کہتے ہیں۔"

"بہت اچھا حضور۔ آپ کی مرضی۔"

"باتیں مت کرو۔ اپنا کام کرو۔"

گاڑی جب تک شہر کی سڑکوں پر سے گزرتی رہی۔ کبھی کبھی لوگوں

کا ایک چُپ چاپ ہجوم نظر آتا رہا جو جنازہ لئے گزر رہے تھے۔ میں پہلے
عرض کر چکا ہوں، اس زمانے میں شہر میں بے پناہ ہیضہ پھوٹ پڑا تھا اِس
لئے شہر کی گلیاں اور بازار وقت سے بہت پہلے سنسان ہو جاتے تھے خرید و
فروخت پر پابندیاں عائد ہو چکی تھیں۔ سڑکوں پر یا تو وہ لوگ رات کے
وقت نظر آتے تھے جو اپنے گرفتار مرض عزیز کے لئے دوا لینے کے لئے
بھاگ رہے ہوتے یا جو اپنے کسی رشتہ دار کی لاش لئے ہوئے جا رہے ہوتے
ورنہ ہر طرف ایک دہشت ناک سناٹا طاری رہتا تھا۔

رفتہ رفتہ گاڑی شہر سے باہر نکل گئی اور ایک اجاڑ سڑک پر چلنے لگی۔
رات گہری اور اندھیری ہوتی جاتی تھی ہر طرف اِک یاس انگیز تنہائی
بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ دُور سے کُتّوں کے بھونکنے کی خفیف آوازیں
آ رہی تھیں۔ سڑک کی خاموشی میں گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز ایسی معلوم
ہوتی تھی جیسے کسی جن کی بارات میں ڈھول پٹ رہا ہو۔ او معبود! وہ
رات !!

میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے میں
نے گاڑی بان سے تیزی سے چلنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہماری گاڑی ایک شکستہ پُل پر سے نیچے اُتر

آئی تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔

"کیا یہی اندھی باولی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی" گاڑیبان نے سرد مہری سے جواب دیا۔ وہ مجھ سے چڑھا ہوا تھا۔

"یہاں تو زندگی کے آثار ہی نہیں" میں نے گنگنایا۔

"میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا" اس نے سرد مہری سے کہا۔

مجھے غصہ آگیا۔ اس لئے میں نے رعب دار آواز میں کہا۔

"گستاخ! تم یہیں ٹھہرو۔ میں اتر کر وہ مکان تلاش کرتا ہوں جہاں میرا مریض میرا انتظار کر رہا ہے"۔

یہ کہہ کر میں گاڑی سے کود پڑا۔ اور ہاتھ میں بیگ لے کر سڑک کے کنارے کنارے ۷ نمبر کا مکان ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھا۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا ہوا بہت دور چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مڑ کر دیکھا تو اب گاڑی کی روشنیاں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ چاروں طرف دہشت ناک تاریکی کا ایک سیلاب لہریں مار رہا تھا۔ ناگہاں دل میں خیال آیا کہ مڑ کر بھاگ جاؤں کہ اچانک کسی انسان کے درد و کرب سے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ میں رک گیا۔ یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی بدنصیب آدمی موجود ہے جو میری مدد کا طالب ہے!

دفعتاً دُور سے ایک روشنی جھلملاتی نظر آئی - مَیں تیز گامی سے اس کی طرف بڑھا - ایک نشیب میں ایک اُجڑے مکان کے دروازے پر ایک دِیا ٹمٹما رہا تھا - مَیں قریب پہنچا تو دیکھا کہ بوسیدہ لکڑی کے دروازے میں ایک سو سال کی سفید رنگ بڑھیا ہاتھ میں مٹی کا دِیا لئے چُپ چاپ کھڑی ہے - مُنہ پر جھُریاں، دانت غائب اور ٹھوڑی باہر کو نکلی ہوئی۔ میرے دل میں ایک عجیب قسم کا اضطرار گہرا اترنے لگا - مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے وہ بوسیدہ مکان کوئی شکستہ اور پُرانی قبر ہے جس میں یہ بوڑھی عورت مُردے کی حیثیت رکھتی ہے - وہ ٹمٹماتے ہوئے دیے کے شعلے کو ٹکٹکی باندھ کر گھُور رہی تھی -

یک لخت بڑھیا نے شعلے پر سے نگاہ اُٹھائی اور پہلی دفعہ مجھے دیکھا - اس کے چہرے پر شدّت، غصّہ اور نفرت کی علامتیں نمودار ہوگئیں۔ زندگی میں مَیں نے کبھی خوف کا نام بھی نہ سُنا تھا - سائنس اور طب میں جو انسان پھنس کر رہ جائے وُہ کبھی خوف اور ڈر جیسے فضول جذبوں سے متعارف نہیں ہوتا - مگر اُس رات، اُس بڑھیا کی غضب ناک نگاہ نے مجھے تھرا دیا - اس کی نظروں سے نظریں بچانے کے لئے مَیں نے اپنی نگاہیں شعلے کی طرف کیں، غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ ایک اِنسانی

کھوپری میں دیا ٹمٹما رہا ہے!

یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب سا لگا، اس لئے میں بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا، بلکہ قریب تھا کہ بھاگ جاؤں۔

مگر اسی پل بڑھیا نے کہا "آپ کا انتظار تھا۔ ڈاکٹر آپ ہی ہیں نا؟"

بڑھیا کے حلق میں سے آواز نکلتی دیکھ کر میں سنبھل گیا۔ ذرا سے توقف کے بعد تردد سے اس کا بے رونق چہرہ تکتے ہوئے میں نے قدم اندر رکھا۔ گھر کیا تھا، اِک ویرانہ تھا، کہیں دیواریں گر رہی تھیں تو کہیں چھتیں غائب تھیں۔ چوکھٹ پر گھاس اُگ آئی تھی۔

میں نے کہا "مریض کہاں ہے؟"

بڑھیا نے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔

اور عجیب وُہ منظر تھا! زعفرانی رنگ کا لمبا کُرتا پہنے، سفید بال گھٹنوں سے نیچے لٹکائے، دیا جو انسانی کھوپری میں جل رہا تھا، ہاتھ میں اُٹھائے بُڑھیا آگے آگے چلی جا رہی تھی، اور میں اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کہیں بغیر چھت کے کمرے کے فرش پر گھاس اُگی ہوئی تھی جو پاؤں میں اُلجھنے لگتی تھی کہیں بوسیدہ کھڑکی کے دروازے کہنیوں سے ٹکرا رہے تھے اور رات بے حد گرم اور نہایت ویران تھی!

آخر وُہ حجرہ آیا جہاں مجھے جانا تھا۔ یہاں پہنچ کر بڑھیا دروازے پر رُک گئی۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ "اندر جاؤ" اور مَیں دِل کڑا کر کے اندر چلا گیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شکستہ چارپائی پر ایک سو سال کا بوڑھا پڑا کراہ رہا ہے۔ اور اس کی دائیں آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اُسی کے کراہنے کی آواز مجھے باہر سڑک پر آرہی تھی۔ اس کی دُوسری آنکھ لہو کی طرح سُرخ ہو رہی تھی اور غول بیابانی کی طرح چمک رہی تھی۔ وُہ مجھے ٹکٹکی باندھے ایک آنکھ سے گھُور رہا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ مَیں سہم گیا۔

"یہی مریض ہے؟" مَیں نے کسی قدر لرزتے ہوئے پُوچھا۔

"ہاں" بڑھیا نے کسی قدر چیخ کر جواب دیا۔

"ان کی آنکھ پر تو کوئی زخم ہے۔ کیا تکلیف ہے؟" یہ کہہ کر مَیں مریض پر جُھکا۔

دفعتہً بڑھیا نے دیا نیچے پٹک دیا۔ اپنا خوفناک لال کُرتا سمیٹ کر دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا لیئے اور خونخوار درندے کی طرح مجھ پر جھپٹی۔ اور میرا گلا دبانا شروع کیا۔ غصہ کی شدت میں الفاظ مرتعش ہو کر اس کے گلے سے نکل رہے تھے "سفاک بدمعاش ڈاکٹر! کیا تجھے یاد نہیں کہ یہ زخم

کس طرح یہاں لگا تھا ؟ ایک رات پہلے کی بات بھول گیا ؟ تُو نے اپنے کمرے میں چاقو اسی لئے تیز کر رکھے ہیں کہ اس سے مظلوموں کی آنکھیں پھوڑا کرے ؟ تُو نے سمجھا کہ تیرا قصور معاف کر دیا جائے گا ؟ لے اب اپنے کئے کی سزا پا "

یہ کہہ کر اُس نے ایک تیز چاقو اُٹھا لیا اور میری آنکھ کی طرف جھپٹی جیسے وہ اسے پھوڑ ڈالے گی !

مَیں بے ہوش ہو کر گر پڑا ۔

دُوسرے دن پولیس نے مجھے اندھی باولی کے کھنڈروں میں سے اُٹھایا ۔

بعض کہتے ہیں ۔ مجھے کوئی ذہنی عارضہ ہو گیا ہے ۔ بعض کا خیال ہے کہ لاشوں کی دن رات کی صحبت نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے ۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ میری آپ بیتی ہے ، اور اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی میری طرف سے نہیں ہوئی ۔

ڈرائیور

علی الصبح مجھے اک ضروری کام پر شورکی جانا تھا۔

شورکی چھوٹی سی جگہ ہے۔ اور وہاں کے اسٹیشن پر ٹرین رُکتی نہیں۔ چنانچہ میں وہاں ہمیشہ کار ہی میں جایا کرتی ہوں۔

میرا پرانا ڈرائیور کریم تین دن کی چھٹی لے کر اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ اُسے علم تھا کہ کل صبح مجھے شورکی جانا ہے۔ وہ یہ وعدہ کر کے گھر گیا تھا کہ مجھے شورکی پہنچانے کے لئے بروقت لوٹ آئے گا۔

رات کے کھانے کے بعد میں زوناش کی مدد سے کچھ ضروری کاغذات سفری بیگ میں رکھ رہی تھی کہ میں نے کہا۔ "زوناش! کریم اب تک نہیں آیا اور مجھے علی الصبح روانہ ہونا ہے"

"ساری رات پڑی ہے خاتون زرّی! بے فکر رہیئے۔ وہ پہنچ جائے گا۔ وعدے کا بڑا پابند ہے" حبش نے بیگ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"پابند تو ہے" میں نے کہا۔ "مگر کیا پتہ؟ کوئی ایسا اتفاق پیش آ

جائے کہ وہ نہ پہنچ سکے ۔ میرے خیال میں احتیاطاً تم زلفی کو فون کر کے
کہہ دو کہ ایک دن کے لئے اپنا ڈرائیور بھیج دیں"۔
"بہت اچھا، پر میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ کریم
اپنے وعدے کا ایسا پکا ہے کہ جس طرح بھی ہوگا وقت سے پہلے پہنچ جائیگا"
"تم ٹیلیفون تو کر دو"
ساڑھے گیارہ بجے میں نے برقی روشنی بجھا دی۔ اور اپنے بستر پر
لیٹ کر دوسرے دن کے ضروری کاموں کی فہرست دل ہی دل میں
مرتب کرنے لگی۔
دسمبر کی ستم انگیز رات تھی۔ سردی شدید تھی۔ بانس اور صنوبر
کے سربلند درختوں پر خنک ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔
میں ایک شوخ نارنجی رنگ کے لحاف میں بلی کی طرح دبکی دبکائی
پڑی تھی۔ آتش دان میں چٹخنے والی صنوبر کی لکڑیوں کے شعلے کمرے
کی تاریک دیواروں پر یوں لرزاں تھے جیسے کسی پرانے غیر آباد راستے
پر بدروحیں دبے پاؤں چل پھر رہی ہوں۔
اچانک گھڑیال نے بارہ بجائے اور میں نے آنکھیں نیند کے لئے
بند کر لیں۔

چند ہی منٹ گزرے تھے، دفعتاً دروازے پر کسی کی دستک نے مجھے چونکا دیا۔

"کون ہے؟"

"ڈرائیور۔ کریم ہوں حضور!"

مَیں نے قدرے حیران ہو کر پُوچھا "کریم! تم آ پہنچے؟"

"صبح آپ کو شوری جانا تھا نا!"

مَیں لحاف میں لیٹے لیٹے بولی۔ "تم نے ناحق تکلیف کی۔ مَیں نے صبح کے لئے خاتون زُلفی کے ڈرائیور کو بُلا لیا ہے۔ خیال تھا واپسی میں شوری سے تمہیں بھی ساتھ لیتی آؤں گی۔ تمہارا گھر کہیں اسی دیہات کے آس پاس ہے نا؟"

"جی"

"اچھی بات، خیال رہے، علی الصبح نماز کے فوراً بعد روانہ ہو جانا ہے۔"

سردی کی پژمردہ اور تاریک صبح میں مَیں نے نماز پڑھی۔ زوناش نے گرم گرم کافی پلائی۔ پھر مَیں شال میں لپٹی لپٹائی باہر نکلی۔ تو کار تیار

بلی۔ یہاں تک کہ کریم اسٹرینگ پر ہاتھ رکھے پا بہ رکاب بیٹھا تھا۔
میرے سوار ہوتے ہی کار چل پڑی۔
خنک ہوائیں جسم میں سوئیاں چبھو رہی تھیں۔ میں نے شیشے چڑھا لئے۔ اور سکڑ کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے اُکتائی۔ تو بیگ کھول کر "پیری لوئی" کا "صحرا" نکال لیا۔ اور مغربی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادی کے پُراسرار اور پُرافسوں مناظر میری تصور کی آنکھ کے آگے پھرنے لگے۔
میں دیر تک مطالعہ میں مستغرق رہی۔ پھر نظر اُٹھائی تو دیکھا۔ کافی وقت گزر چکا ہے۔ سردیوں کے غیر دلچسپ پھیکے آسمان پر مریض سا سورج پژمردہ چہرے سے چمکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور سفید دھوپ کُہر کو چیر کر میدانوں میں اُتر رہی تھی۔
میں نے کتاب بند کی۔ اِدھر اُدھر بے لطفی سے دیکھا۔ جمائی لی اور بولی۔ "تم پہلے اس راستے سے جا چکے ہونا؟ قریب ترین راستے سے چلنا کیونکہ میرا وہاں ایک بجے تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔"
"حضور میں بارہ بجے آپ کو وہاں پہنچا دوں گا۔"
"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے، اس کے معنی یہ کہ میں ایک گھنٹہ

آرام بھی کر سکوں گی۔ مگر دیکھو، بہت تیز نہ چلو۔ کہیں ٹکر نہ لگ جائے۔ ایک گھنٹہ دیر میں پہنچنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم کسی پہاڑ یا درخت سے ٹکرا جائیں اور کبھی نہ پہنچ سکیں۔"

یہ کہہ کر مَیں نے کتاب کھول لی اور پھر مطالعہ میں غرق ہو گئی۔

اچانک مَیں اپنی سیٹ پر اُچھل پڑی اور کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے قدموں میں جا پڑی!

مَیں نے غصّے سے کریم کی طرف دیکھا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں کار فی گھنٹہ ساٹھ میل پر جا رہی ہے؟"

"دیکھ رہا ہوں حضور! مگر بارہ بجے شوری پہنچنا ضروری جو ہے ــــ"

"کوئی ضروری نہیں"۔ مَیں نے غصّہ کو ضبط کر کے کہا۔

مجھے لحہ بہ لحہ کار کی رفتار میں اور تیزی محسوس ہونے لگی۔ مَیں نے دیکھا اُس نے رفتار ستّر میل کر دی ہے۔ اطراف کے مناظر ایک ہیبت ناک وارفتگی میں اُڑے جا رہے تھے۔ سڑک کے کنکر اُڑ اُڑ کر کار کے شیشوں پر لگ رہے تھے اور کار کے پیچھے کے شیشے میں سے گرد و غبار کے بگولے اُڑتے نظر آ رہے تھے۔

"کار روکو"۔ مَیں نے انتہائی غصّہ کی حالت میں کہا۔

"کار نہیں رُکے گی خاتون رُوحی۔ بارہ بجتے بجتے شوری پہنچنا ضروری ہے۔"

"ضروری ہے! کیوں؟"

"کیونکہ بارہ بجنے کے بعد ــــــ"

"بارہ بجنے کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"آپ پہنچ نہ سکیں گی۔"

"کیوں؟"

"جنازہ پہنچ جائے گا!"

"جنازہ!" میں نے کانپ کر کہا۔ "کس کا؟"

اُس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔ کار ضبط و احتیاط کو نظر انداز کر کے ایک بے عنان جنُون میں اُڑی جا رہی تھی!

مَیں بدحواس ہو گئی۔ چیخ پڑی۔ "روکتے ہو یا نہیں؟"

"نہیں۔"

میرا خون جسم میں جم گیا۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا، یہ شخص ایک خوفناک جنونی ہے یا کسی شدید مرض میں مبتلا ہے۔ وہ میرے پاس چھ سال سے تھا۔ میری تمام کاروں کا وُہ ہی نگراں تھا۔ بے حد محتاط تھا ایسا گستاخ کبھی نہ تھا۔

مَیں کانپ گئی۔ جنازے کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پیچھے گرد کا طوفان، سامنے کنکریوں کی بارش! دروازے کے شیشوں کے ٹوٹنے کا ہر وقت خطرہ! میرا دِل دھک دھک کر رہا تھا۔ مَیں خدا سے دُعا مانگ رہی تھی کہ جلد سے جلد کوئی حادثہ پیش آجائے اور یہ خوفناک سلسلہ اختتام پر پہنچے۔

مَیں نے ڈرتے ڈرتے کریم پر نگاہ ڈالی۔ اور اپنے کو ہچکولوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دریچے کے قریب کے شیشے ڈورے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ دہشت زدہ ہو کر چیخی "کریم! تم بیمار تو نہیں؟"

"اب اچھا ہوں۔"

"یعنی! بیمار تھے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر آئے کیوں؟ تمہیں آرام کی ضرورت تھی۔"

"آپ کو شوری جو پہنچانا تھا۔"

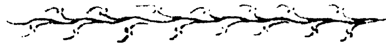
شدّتِ خوف کے مارے میرے حلق سے اب آواز نہ نکلتی تھی۔ وُہ لمحہ بہ لمحہ رفتار تیز کر رہا تھا۔ اَور تیز ـــــ اَور تیز! رفتار پیما آلے کی سُوئی اُوپر کو چڑھتی جا رہی تھی۔ چڑھتی جا رہی تھی!! ستّر سے اُوپر ـــــ اسّی! اسّی سے اُوپر نوّے

اور پھر — نوّے سے اُوپر سنّو! باہر کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ معبود! میرے معبود!! ایک وحشی بگولا چیخیں مارتا ہوا مجھے فنا کی طرف لئے جا رہا تھا۔
میری چیخوں نے کہا "احمق! یہ کیا کر رہا ہے! اُف اُف۔ خدا کے لئے کار روک دو۔ دیکھو میرے ساتھ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے ——
کہاں جا رہے ہو؟ —— کہاں؟ لو شوری پہنچ گئے۔ اب تو روکو۔ یہ شوری کا قبرستان سامنے آگیا —— آگیا ——"
مَیں نے ایک دیوانہ وار چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔
کار اپنے جنون میں ایک مٹی کے ٹیلے پر چڑھ گئی تھی، اور پھر ——؟
اور پھر بڑے زور سے جیسے فنا کے قعر میں گر پڑی۔ ایک دھماکے کے ساتھ۔ جیسے گرجنے والے سمندر میں آسمانوں سے بجلی گرتی ہے۔

جب آنکھ کھُلی تو سُورج قبرستان پر اپنی بے نیاز شعاعیں پھینک رہا تھا۔ مَیں ٹوٹی ہوئی کار کے سائے میں لاش کی طرح پڑی تھی۔
قبرستان کا دروازہ کھُلا۔ اور لوگوں کے ہجوم کی آواز آئی۔ مَیں نے نظر اُٹھائی تو دیکھا، کہ لوگ ایک جنازہ لئے اندر داخل

ہو رہے ہیں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ گزشتہ رات بارہ بجے کے قریب ڈرائیور کریم کا ہیضے سے انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت بارہ بجے اُسے دفنانے کے لئے اس قبرستان میں لے آئے ہیں۔



پچیس۲۵ منٹ

ہر روز صبح کاربولک ایسڈ اور سپرٹ کی جراثیم کش بُو سے میری رُوح لرز جایا کرتی۔ پھر جب ڈاکٹر اپنا ایپرن پہن کر، اور آستین چڑھا کر میری طرف بڑھتا، اور بڑی بے دردی سے میری کلائی کو تختۂ مشق بنانے پر تُل جاتا تو مجھے چکر سے آنے لگتے۔

کئی دنوں سے میری کلائی زخمی تھی۔ اس میں شیشہ کا ایک ٹکڑا اُتر گیا تھا۔ پھر زخم خراب ہوگیا۔ یہ زخم شاعروں کے "زخمِ دل" سے بالکل مختلف تھا۔ اور جب روئی کا پھاہا اس پر رکھا جاتا تو ـــــ توبہ! اس زمانے میں مَیں اکثر تذکرۂ انبیاء میں حضرت ایوبؑ کے حالات دلی شوق سے پڑھا کرتی تھی، اور اس سے دل کو ڈھارس بندھتی تھی۔

جس صبح کلائی کا اپریشن کیا جانا تھا، میری بُری حالت تھی۔ رات ہی سے مختلف وضع کے چھوٹے بڑے تیز، اور تیز تر نشتر میری بدنصیب

آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے۔

صبح ڈاکٹر مسکراتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔ جیسے کسی کو مبتلائے کرب دیکھنا، اسے آمادۂ تبسم کر رہا ہو۔ "آپ اپنے نتھے منے سے اپریشن کے لئے بالکل تیار ہیں نا خاتون رُوحی؟"

"ہاں ہاں ـــــ" میں نے مسکرانے کی کوشش کی، پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں نہیں!"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا: "معلوم ہوتا ہے صرف ایک پل بھی آپ کے نیک ارادے میں خلل انداز ہوسکتا ہے۔ ذرا کلائی تو دکھائیے!"

جملہ ختم ہوتے ہی ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو سامانِ جراحت تیار کرنے کو کہا اور ایک روشن اور لمبے دریچے کے آگے آناً فاناً میں اپریشن کا سامان تیار ہو گیا۔ میں اپنی کلائی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ڈاکٹر سے کوئی آٹھ گز کے فاصلے پر کمرے کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ باہر باغیچے میں تندرست چڑیاں مصروفِ نغمہ تھیں اور فوارے کے پاس ایک گُلِ سوسن قہقہہ لگا رہا تھا۔

"آیئے!" ڈاکٹر کی آواز آئی۔

"اپریشن میں دیر کتنی لگے گی؟"

"پانچ منٹ!"

"پانچ منٹ!!؟" میرے منہ سے نکلا۔ "بہت ہیں ڈاکٹر۔ پانچ لمحوں میں نہیں ہوسکتا؟"

ڈاکٹر ہنس پڑا اور میری کلائی پکڑ کر دریچے کی روشنی میں لے آیا۔ اور بولا "خاتون رُوحی! آپ کا زخم دیکھ کر مجھے آج سے سات سال قبل کا ایک خوفناک واقعہ یاد آگیا۔ آپ اپنے ذراسے زخم کو دیکھ کر ہراساں ہوگئیں؟ اپنی کلائی میرے سپرد کر دیجئے اور آرام سے اس کرسی پر بیٹھ جائیے۔ ہاں تو وہ خوفناک واقعہ سُنیں گی؟"

"سُنوں گی۔ بشرطیکہ وہ آپ کے کام میں خلل انداز نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ اطمینان رکھئے، کوئی خلل نہ پڑے گا۔ سات سال پہلے کی بات ہے میں میڈیکل کالج میں تھا۔ اُس زمانے میں ہمیں تقریباً ہر روز لاشوں کو چیرنے پھاڑنے کا موقعہ مل جاتا تھا۔"

"اور آپ کو اس میں لُطف آتا تھا؟" میں جل کر بولی۔

"مجھے اس شغل سے خاص شغف تھا خاتون رُوحی اور ——"

"دیکھئے دیکھئے میری کلائی ——"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں —— میں عموماً رات کو سنسان وقت،

گھنٹوں اسی شغل میں محو رہتا تھا اور دو دو بجے گھر لوٹتا تھا۔ جب میں گھر
لوٹتا تو مجھے راستے میں گاؤں کے قبرستان پر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔
ایک رات جب میں قبرستان پر سے گزر رہا تھا تو مجھے کسی کے کراہنے
کی آواز آئی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کے
بعد ہر روز رات کے وقت جب میں قبرستان پہنچتا۔ تو کراہنے کی آواز
آنے لگتی۔ لیکن نیند کا غلبہ اس قدر ہوتا کہ مجھے اس آواز کی تلاش
کا نہ کبھی خیال آیا نہ وقت ملا۔
ایک رات میں خلافِ معمول ذرا جلدی یعنی کوئی بارہ ایک بجے اسی
راستے پر سے گزر رہا تھا۔ گرمی شدید تھی اور تاریکی غیر معمولی۔ البتہ آسمان
پر بوڑھے تارے چیپاں تھے۔ مگر چونکہ میں بید مجنوں اور ناشپاتی کے
درختوں کے نیچے سے گزر رہا تھا اس لئے میرے اطراف تاریکی ہی
تاریکی تھی۔
میں قبرستان کی دیوار تک پہنچا تو مجھے کراہنے کی آواز آئی۔ آج یہ
آواز زیادہ قریب اور واضح تھی جیسے کوئی شخص انتہائی درد کو ضبط کرنے
کی کوشش کے باوجود کراہنے پر مجبور ہو۔ آہ خاتون رو رہی۔ وہ دردناک
آواز۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل میں اُتری جا رہی ہے۔"

"میری کلائی میں کوئی چیز اُتری جارہی ہے ۔ اُف !" میں نے کہا۔
ڈاکٹر نے کوئی اوزار طشت میں چھن سے پھینکا اور دُوسرا اُٹھا لیا۔
"مجھے معلوم ہُوا کہ یہ آواز قبرستان کے اندر سے آرہی ہے مجھے بڑا تعجب ہُوا کہ دُنیا گورستان کے سکوت و سکون کی تعریف کرتی ہے ، یہ کون بدنصیب اس سکوت میں خلل انداز ہو رہا ہے ! میرے دِل نے کہا پھر میں نے قبرستان کی دیوار سے اپنے کان لگا دیئے ۔ یہ آواز رقصاں تھی یعنی کراہنے والا اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا ۔ وہ آواز کبھی قبرستان کے اس حصّے سے آتی تھی کبھی اس حصّے سے ۔ میرے دل میں اس مبتلائے کرب بدنصیب کو دیکھنے کی خواہش چٹکیاں لینے لگی اور میں پنجوں پر کھڑا ہو کر اندر جھانکنے لگا۔ مگر اندر تاریکی تھی ۔ صرف تاریکی ۔ ناشپاتی اور بید مجنوں کے درخت کالی کالی قبروں پر چپ چاپ کھڑے تھے !
دفعتہً پھر کراہنے کی آواز آئی اور میں نے فوراً سر پھیر کر دیکھا ۔ اُف خاتون روحی ۔ تاروں کی چھاؤں میں میں نے ایسا خوفناک منظر دیکھا کہ لرز گیا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ قبروں کے درمیان کوئی گوریلا ناچ رہا تھا۔"
"گوریلا !"
"مجھے شبہ ہُوا کہ گوریلا ہے ۔ مگر جب میں نے اس کی کراہ سنی تو مجھے

انسان ہونے کا شبہ ہوا۔ میں رات میں پہچان نہ سکا کہ وہ انسان تھا یا کوئی جانور
دوسری رات میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ قبرستان کے اندر جا پہنچوں گا
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں قبرستان کی دیوار پھاند کر اندر جا پہنچا۔ اور جنگلی گلاب
کی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

کراہنے کی آواز آج زیادہ شدت اور زیادہ بے بسی کے ساتھ آرہی
تھی۔ میں نے دیکھا قبروں کے درمیان انتہائی تکلیف کے مارے کوئی
کراہ رہا اور ناچ رہا تھا۔ دو لمحے بعد مجھے شبہ ہوا کہ اس نے مجھے دیکھ
لیا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی کراہ ضبط کر لی تھی، اور پیچھے جھاڑیوں کی طرف
جانے لگا تھا۔

میں نے فوراً ٹارچ جلائی اور روشنی پھیل گئی۔ وہ گھبرا کر قبروں کے
درمیان کہیں غائب ہو گیا۔ میں تیزی سے اس کی طرف چلا۔

مٹی کے تپتے ہوئے آسمان پر بوڑھے تارے ساکت تھے، اور گورستان
کی زمین سے ایک عجیب المناک خوشبو نکل نکل کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔
میں نے ہر طرف پھر کر دیکھ لیا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں روحوں کا
قائل تو تھا نہیں کہ یہی سمجھ کر دل کو تسلی دے لیتا کہ کوئی گنہگار روح اپنے
اعمال نامے پر مصروفِ گریہ ہے۔ میں ڈاکٹر تھا خالص روحی ـــــ ایک طبی آدمی!

اس لئے ہر چیز کو عقل کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے مَیں نے ہر طرف ہر گوشے میں گھوم کر اطمینان کر لیا اور آخر مایوس ہو کر واپس جانے کی ٹھانی۔

مَیں جب واپس جانے لگا تو یکایک ایک آہ کی آواز آئی اور مَیں رُک گیا۔ سامنے یعنی میرے قدموں میں جو قبریں تھیں انہی میں سے کراہنے کی نہایت دھیمی آواز آرہی تھی۔ مَیں بیٹھ گیا۔ بلاشبہ یہ کسی مبتلائے کرب کی آواز تھی۔

مَیں چُپ تھا۔ مَیں نے اپنا سانس تک روک لیا تھا تاکہ کسی کو میری موجودگی کا علم نہ ہونے پائے۔ مَیں قبروں میں بیٹھ گیا۔ کس قدر تعجب ہوا ہے جب یہ آواز بالکل میرے قدموں کے نیچے والی قبر میں سے آنے لگی! مَیں پنجوں کے بل چلنے لگا اور اس قبر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی جانور اس قبر میں گھُس گیا ہے۔ کیونکہ کراہ کی آواز آدھی انسانی تھی اور آدھی ـــــ کیا بتاؤں غیر انسانی نہایت خوفناک!"

"تو کیا قبر کھُلی ہوئی تھی؟"

"جی ہاں ـــــ کیونکہ میرا ہاتھ ایک ناہموار جگہ پر رُک گیا۔ وُہ قبر کا ایک کھلا ہوا کونہ تھا۔ جُونہی مَیں نے اپنا چہرہ اس کے سامنے کیا تو میرا سر

چکرا گیا۔ اندر سے ایک عجیب مندار بُو نکل رہی تھی۔ مَیں نے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔ اندر سے کسی کی سانس کے آہستہ آہستہ آواز آ رہی تھی خاتون رُوحی!

مَیں نے ٹارچ جلائی اور قبر کے اندر دیکھا —— اور —— اور —— ششدر رہ گیا۔ مَیں نے زندگی میں سینکڑوں انسانی لاشوں کو چِرا ہے بیسیوں خوفناک مناظر دیکھے۔ مگر جو چیز اندر دیکھی، اسے دیکھ کر میرے جسم میں ایک پھریری سی آئی۔"

"تو اندر کیا دیکھا؟" مَیں بے چین ہو کر بولی۔

"اندر؟ —— اُف! کوئی لیٹا ہُوا تھا۔ وہ گوریلا نہ تھا۔ گوریلے کے جسم پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ مگر وہ تو کھال اُترے ہوئے بکرے کی مانند تھا۔ خدا کی پناہ، گوشت کا ایک لوتھڑا!"

"یعنی؟"

"وُہ انسان تھا خاتون رُوحی۔ مگر انسان کہلائے جانے کا مستحق نہ تھا۔ اور اگر وہ خود اپنے آپ کو انسان نہ کہتا تو مَیں کبھی نہ سمجھ سکتا کہ وُہ کیا تھا۔ وُہ پوست بریدہ بکرے کی طرح گہرے گلابی رنگ کا تھا جس جگہ پر چہرے کا شُبہ ہو سکتا تھا، اس جگہ سے کراہنے کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ مَیں دیر تک نہ سمجھ سکا کہ اس نے مجھے دیکھا بھی یا نہیں، اور پھر مَیں نے ہمت کر کے

پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

اس میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور جواب ملا "انسان"۔

میرے ہوش و حواس جاتے رہے اور میں لرز گیا۔ پھر اس نے اپنی سرگزشت کہہ سنائی۔ اسے سن کر آپ کیا کریں گی؟ اس نے بیان کیا کہ کس طرح ایک خوفناک دلدل میں پھنسنے کے بعد اسے ایک جلدی بیماری لاحق ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس نے یہ شکل اختیار کر لی۔ اور پھر دنیا میں اس کے رہنے سہنے کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ پھر اس نے ایک پرانی قبر کو اپنا مسکن بنایا۔ وہ تمام دن اندر لیٹا رہتا اور رات کے وقت باہر نکلتا۔ اور درخت سے ناشپاتی ——"

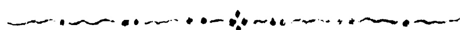
اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے ایک تیز قینچی جس سے طشت میں پھینکی اور بینڈیج کو گرہ دیتے ہوئے کہا "خاتون۔ رو تی! خدا کا شکر ہے یہ تکلیف دہ اپریشن ختم ہو گیا۔ پچیس منٹ لگے! مجھے ڈر تھا آپ —— خیر تو سنا آپ نے؟ آپ سے زیادہ مصیبت زدہ لوگ۔ اس دنیا میں بستے ہیں۔ اور آپ کے اپریشن میں پچیس منٹ ہی لگے!"

اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پہلی دفعہ میں نے درد محسوس کیا۔ "پچیس منٹ!" میں نے بھی پوچھا۔

"اور اس شخص کا کیا ہوا؟"

ڈاکٹر ہاتھ دھوتے ہوئے بولا "کس شخص کا؟ ہاں وہ؟ —— وہ تندرست ہوگیا خاتون رُوحی —— جیسے آپ ہوگئیں" اور وہ زور سے ہنس پڑا ۔



جو کچھ کہ دیکھا!

کسی طرح جان نہ نکلتی تھی!

پندرہ دن سے بسترِ مرگ پر نزع کی رُوح فرسا ہچکیوں میں گرفتار پڑا رہنا، اور جان دے دینے کی انتہائی کوشش کے باوجود رُوح کا جسدِ خاکی سے چمٹے رہنا ایک جہنمی عذاب تھا۔ نہ صرف مریضہ کے لئے بلکہ معالجوں اور تیمارداروں کے لئے بھی۔

پندرہ دن پہلے ایک صبح جب میں زبیدہ کو دیکھنے سنی ٹوریم گئی تو میرا خیال تھا کہ اُسی دن غروبِ آفتاب تک اس کے سرنگوں پیمانۂ حیات کی آخری بوند کنارے پر سے ٹپک پڑے گی۔ اُس کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ سینے میں درد کی شدت نے چہرہ مستقل طور پر مسخ کر رکھا تھا۔ بیماری کی طوالت سے سانس اُکھڑ گیا تھا۔ زبان لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھی اور اکثر منہ کے باہر نکل آتی تھی۔

جب میں کار میں بیٹھنے لگی تو ڈاکٹر نے سرگوشی میں مجھ سے کہا

"خاتون روحی! نہ جائیے۔ دو بجے تک انتظار کر لیجیے۔ شاید اس سے پہلے ہی ــــــــ"

یہ سن کر میں سہم گئی تھی۔ میرا ایک ہاتھ وہیں اسٹیرنگ پر دھرا کا دھرا رہ گیا۔ ایک لمحہ بعد سسکی لے کر میں کار سے اتر آئی اور زبیدہ کے وارڈ کے آگے برآمدے میں آنکھوں پر رومال رکھ کر بیٹھ گئی۔ کبھی کبھی دریچے سے اندر نظر ڈال لیتی۔ دو نوجوان نرسیں اس کے قریب بیٹھی اپنے عاشقوں کے لئے سوئٹر بن رہی اور آہستہ آہستہ ہنس بول رہی تھیں۔ جیسے موت انہیں کبھی اس رنگین دنیا سے جدا نہ کرے گی! عالمِ نزع کے اس گرفتار کی طرف ان کا خیال بھولے سے بھی نہ جاتا تھا۔

میرا دل کٹ گیا۔

زبیدہ! میرا خیال ماضی کی طرف جا نکلا۔ جامعہ سلطانیہ میں اس کی میری سالہا سال کی یکسجائی، وہ لطف کے دن، اور عیش کی راتیں! وہ ہم جماعتی کا رنگیں زمانہ! ــــــــ پھر تکمیلِ تعلیم کے بعد میرا سیاحت چین میں اور زبیدہ کا دشتِ عشق میں بادیہ پیمائی کرنا!! ... عشق کی ناکامیاں ــــ بےوفائی کی ٹھوکریں ــ اور پھر ... اور پھر اس کا المناک

نتیجہ دق !

زیدہ کوئی دولت مند لڑکی نہ تھی۔ اس کے زمانہ طالب علمی میں بھی میں اس کی کفیل رہی۔ اس کے بعد بھی اُسے میرا ہی سہارا رہا۔ اور جب وہ کاروانِ حیات سے بچھڑ کر روش کی گمراہی سے خستہ حال میرے پاس پہنچی تو اپنی پیاری سہیلی کو دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔

مجھے یاد ہے ایک سال قبل میں نے اس سے کہا تھا "زیدہ! عشق کی ناکامی کوئی ایسی چیز ہے کہ انسان اس کے پیچھے اپنا سب کچھ لٹوا بیٹھے؟"

"روحی! تم کچھ بھی نہیں جانتیں"

"مگر زیدہ! تمہیں ہلکی ہلکی کھانسی شروع ہوگئی ہے"

پھر میں اسے لئے لئے شہر کے مشہور ٹی بی کے ماہر ڈاکٹروں کے پاس پھرتی رہی، اس کے بعد دق کا شدید حملہ شروع ہوگیا۔ اور میں نے اسے سنی ٹوریم میں داخل کرادیا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ میں اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ گھبرا کر زیدہ کی طرف دیکھا، وہ بالکل اُسی حالت میں پڑی کراہ رہی تھی۔

یہ آج سے پندرہ دن پہلے کا واقعہ ہے ۔ اس کے بعد میں جب بھی گئی اُسے اسی حال میں پایا ۔ نرسیں اس کی زندگی سے اُکتا چکی تھیں ، اور ڈاکٹر حیران تھے ۔

پندرہ دن اسی حالت میں گزر گئے ۔

جب سولھویں دن صبح میں سنی ٹوریم گئی تو نرس نے مسرت کو دبا کر کہا ۔ " جلد پر نیلاہٹ نمودار ہو گئی ۔ آخری علامت ! "

میں نے ایک ستون کا سہارا لے لیا اور نرس کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا ۔

زبیدہ کی چارپائی کے پاس جانے کا حوصلہ نہ تھا ۔ وُہ ہیبت ناک طور پر بدل چکی تھی ۔ جیسے موت کی بے صبری نے زندگی تمام ہونے سے پیشتر ہی اس کے جسم کو اپنی دست بُرد کا شکار بنانا شروع کر دیا ہو ۔ وہ ایک نرالی لاش معلوم ہوتی تھی جو حشرات الارض کی اذیتوں سے بے تاب ہو کر زمین سے باہر چھلانگ پڑی تھی ۔ خشک زبان باہر کو لٹکی ہوئی تھی ۔ آنکھیں نیم وا تھیں ۔ چڑھی ہوئی پتلیوں نے کرب کی شدت کو عیاں کرنے کے لیے صرف ڈھیلوں کی خوفناک سفیدی کھلی چھوڑ دی

تھی۔ ناک مڑ چکی تھی اور جبڑے کی ہڈیاں کیلوں کی طرح اوپر کو ابھر آئی تھیں۔ بے بس پھیپھڑے ہر سانس کے ساتھ جواب دیتے معلوم ہوتے تھے۔ اور گلے سے ایک ہولناک مدھم آواز مسلسل نکل رہی تھی۔ غرض ع :-

"تنِ مریض میں دم کا شمار باقی تھا"

میں وحشت کے عالم میں ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرنے کی تاکید کر کے گھر چلی آئی۔

۳

شام تک ٹیلیفون کی ہر گھنٹی پر شبہ ہوتا تھا کہ زبیدہ کی موت کی اطلاع ہے مگر رات کے گیارہ بج گئے اور کوئی اطلاع نہ آئی۔

آخر میری بوڑھی حبشن خادمہ زوناش کو سنی ٹوریم سے پوچھنے پر نرس نے اطلاع دی کہ ابھی زندہ ہے۔

تمام دن کے شدید تردد نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا۔ زوناش کو ٹیلیفون کے پاس بٹھا کر میں تیسری منزل پر اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔ برقی پنکھا زور سے چلایا۔ چمن کے تمام دریچے ہوا کے لئے کھول دیئے۔ صرف ایک بند رکھا جس میں سے قبرستان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ دریچوں سے باہر گرمی کی سنسان رات دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سنہری چاندنی

میں ہر چیز سُن سی نظر آ رہی تھی۔

بستر پر لیٹی تو پندرہ دن کے ہولناک تصورات نے مجھے اپنے نرغے میں لے لیا۔

میں نے ڈانپتے ہوئے ہاتھوں سے چادر اپنے اُوپر کھینچ لی۔

۴

دفعتاً زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔

"زوناش! زوناش!" میں نے آواز دی۔ مجھے یقین ہو گیا بوڑھی زوناش زبیدہ کی خبرِ مرگ سنانے آ رہی ہے مگر قدموں کی چاپ اچانک غائب ہو گئی۔ اور کچھ دیر بعد دروازہ آپ سے آپ آہستہ سے کھلنے لگا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ شاید گرم موسم کی ہوا کا کوئی جھونکا تھا ــــ ؟ ؟

پھر یکلخت میری نظریں چھت پر روشندان کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں نے دیکھا وہاں ایک عورت سفید چادر لپیٹے ٹانگیں لٹکائے یوں آمادہ بیٹھی تھی جیسے نیچے کُودنے والی ہو۔

میں پسینے میں نہا گئی۔ میرا دل خوفناک طور پر دھک دھک کرنے لگا۔ عورت میری طرف مُڑ گئی۔ مگر اس کا چہرہ مجھے نظر نہ آیا۔ میری بینائی کام نہ کر رہی تھی، اس نے گھونگھٹ نکال رکھا تھا، وہ بولی "پانی! مجھے پیاس لگی ہے!"

اسے بولتے دیکھ کر میری سوکھی ہوئی زبان نے بمشکل پوچھا: "تم وہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اور یہاں آئیں کیسے؟"

وہ بولی: "میں وہاں کی زندگی سے تنگ آ گئی تھی۔ اب اچھی ہوں، اس لئے آ گئی۔"

"کہاں کی زندگی سے؟" میں نے اپنی آواز سنی۔ "کیا تم بیمار تھیں؟"

"بہت سخت!" پھر بولی: "لیکن اب بالکل اچھی ہوں۔ کیا تمہیں یقین نہیں آتا؟ اگر تمہیں یقین نہیں آتا، اگر تمہیں میری تندرستی کا یقین نہیں تو دیکھ لو مجھ میں اب کتنی طاقت آ گئی ہے۔"

یہ کہتے ہی وہ روشندان سے نیچے کود پڑی۔

میں نے وحشت زدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور اپنے بستر سے اٹھ کر ہانپتی ہوئی صوفے کے پیچھے بھاگی۔

اس نے کندھے سے ایڑیوں تک ایک سفید چادر لپیٹ رکھی تھی۔ وہ تیزی سے بڑھی اور قالین پر بے حد سرعت سے قلابازیاں کھانے لگی اس پھرتی سے کہ مجھے اس کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ صرف ہوا میں ایک سفید شفاف چیز گھومتی نظر آ رہی تھی۔ وہ گویا اپنی طاقت اور تندرستی کا سکہ مجھ پر جمانا چاہتی تھی۔

میں ایڑی تک پسینے میں نہا چکی تھی ۔ میرا دل جیسے تھم چکا تھا ۔ اس خوفناک شغل کو روکنے کے لئے ایک چیخ مجھ میں سے پھوٹ پڑی "بس کرو"۔
اور جب وہ تھم کر کھڑی ہو گئی تو میرے منہ سے ایک اور چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اس کی سفید چادر والے گھونگٹ میں سے مجھے ایک خشک اور سخت زبان باہر لٹکی ہوئی نظر آئی۔ زبان! —— بالکل زبیدہ کی سی خشک زبان! اور میں دیوار کے ساتھ ایک بت بن کر رہ گئی۔
"مجھے پیاس لگی ہے" اس نے کہا اور پھر خود ہی صراحی میں سے پانی انڈیل انڈیل کر پینے لگی۔ گلاس پر گلاس۔ گلاس پر گلاس! اور ذرا دیر بعد خالی صراحی کو دیوار پر دے مارا۔
یکایک گھوم کر بولی ۔ "میں جا رہی ہوں روحی"
روحی؟ —— کیا وہ میرا نام جانتی تھی؟ —— کیا وہ —— کیا وہ زبیدہ تھی ....؟ نہیں نہیں ——"
"کہاں ——" شاید میں نے پوچھا۔
"اُدھر ——" اس نے بند دریچے کی طرف اشارہ کیا جس میں سے قبرستان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور جسے میں اکثر بند رکھا کرتی تھی۔
اس نے دریچہ کھول دیا اور اس میں چڑھ گئی اور پھر باہر کود پڑی میری

ششدر نظروں نے چاندنی کے افسوں میں دیکھا کہ وہ اپنی سفید چادر سمیت قبروں پر ہوا میں کسی عظیم خفاش کی طرح تیر رہی ہے۔ دفعتاً اُس نے چادر اپنے چہرے سے ہٹا دی۔ مَیں نے اس کا چہرہ دیکھا تو ایک ذرا دیر کے لئے مجھے احساس ہُوا کہ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور میرا بوجھ اُٹھانے سے جواب دے رہی ہیں، وہ بسترِ مرگ پر پڑی ہوئی زبیدہ تھی! اور قبروں پر سفید چادر میں لپٹی ہوئی چیل کی طرح گھوم رہی تھی۔

۵

رات کے ساڑھے بارہ بجے زونا شش مجھے اُٹھا رہی تھی "خاتون جی! اُٹھئے سنی ٹوریم سے ٹیلیفون آگیا!"

جنازہ

(۱)

جنوری کی ایک سرد رات تھی۔ آسمان پر بادل ایک خاموش استقلال سے مسلط تھے۔ چمن کے سوکھے پتے دریچے کے باہر خنک ہوا سے رہ رہ کر بے قرار ہوتے اور شور مچا رہے تھے۔ ایسے وقت میں میں اپنی حسین نشست گاہ میں ایک اونچے برقی لمپ کے نارنجی رنگ فانوس کے نیچے ایک مخملی آرام دہ کرسی پر بیٹھی تھی اور "بغداد ٹائمز" کے بڑے بڑے تختے کھولے مختلف عنوانوں پر نظر ڈال رہی اور بیرونی دنیا کے وحشت خیز اثر کو مطالعہ کی دلچسپی میں محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے آتشدان میں صندل کی لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔

اتنے میں میری بوڑھی قدیم حبشن زوناش اندر آئی اور میری رفاقت کے لئے ایک چھوٹی سی میز پر قہوہ کا سامان رکھ کر آہستہ سے پھر باہر چلی گئی۔ رفتہ رفتہ برآمدے سے اس کی نقرئی چوڑیوں کی جھنجھناہٹ اور عمر خیام کے اشعار کی گنگناہٹ بند ہو گئی۔ خاموشی جس میں عناصر کی بے چینی کے سوا اور کوئی

آواز نہ تھی، دمبدم ایک بوجھ کی طرح روح پر بیٹھتی جا رہی اور طرح طرح کے اوہام و وساوس بیدار کر رہی تھی۔

یکا یک دروازے پر ایک محتاط دستک نے مجھے چونکا دیا - آپ جانتے ہیں میں ایک بہت کمزور دل کی عورت ہوں اور عام مشرقی لڑکیوں کی طرح بے حد اوہام پرست، یہی وجہ ہے کہ میں اختیار مجھ سے دور کھینچ کر رہی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ اس ویران اور وحشت ناک رات میں ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کیا شے دروازے کے کواڑوں کو ہلا سکتی تھی۔

میں گھبرا کر نشست گاہ سے باہر نکل آئی اور دروازہ کی طرف نظر اٹھائی۔ اس کے شیشوں میں سے ایک دہکتے ہوئے سگار کو دیکھ کر میرا اندیشہ رفع ہو گیا۔ کسی الو کھے وقت محتاط دستک کے ساتھ سگار کا نظر آ جانا سب کی سب بوڑھے ڈاکٹر گار کی آمد کی علامات ہیں۔ میں ایک روحانی اطمینان سے دروازے کی طرف لپکی اور چٹخنی کھول دی۔

"سلام شون ڈاکٹر!" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔ "کیا شہر میں امراض کی بہت کثرت ہے جو آپ عید کا چاند بن گئے ہیں؟"

ڈاکٹر اپنے پسٹر پر سے مفلر اتارتا ہوا بولا "ڈاکٹر کبھی اپنے وقت کا مختار نہیں ہوتا بیٹی روحی!"

میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی "آپ کی اس بے اختیاری نے اس وقت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس طوفانی رات کی تنہائی سے گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ آئیے اندر آئیے۔ آگ دہک رہی ہے قہوہ تیار ہے۔ سگاروں کا ذخیرہ آپ کی جیب میں موجود ہی ہوگا۔ اور نسوار کی ڈبیہ آپ کے ہاتھ میں ہے ہی! بس اس کے سوا اور کس بات کی کسر رہ گئی کہ آپ اطمینان سے بیٹھ کر مجھے اپنے قصے سنائیں کہ آپ کی ان دنوں کی ساری غیر حاضری کی کسر نکل جائے۔"

ڈاکٹر گارڈنر لذت اندوزی کی آہ کے ساتھ آتشدان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ آگ کی طرف بڑھا کر بولا "میں کیا قصے سناؤں بچی! ڈاکٹر ——بھر بوڑھا—— تم سناؤ اپنی سیاحت کے افسانے۔"

میں ہنس پڑی "کئی دنوں سے میرے سر میں درد ہے ڈاکٹر۔ اور اعصاب ٹھکانے نہیں۔ میرے صنوبری (ہوائی جہاز کا نام) کی تباہی کا حال تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ اس حادثہ نے میرے دماغ پر بڑا اثر ڈالا۔ طبیعت متوحش سی رہنے لگی ہے۔ مہینوں سے کوئی چیز نہیں لکھی، کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی۔" یہ کہہ کر میں نے قہوہ دان اٹھا لیا۔ اور ڈاکٹر کے لئے قہوہ پیالی میں ڈالتے ہوئے بولی "آپ کے پاس قصے کہانیوں کی کمی ہے؟ یوں

کہئے کہ ان دنوں انہیں بیان کرنے کے لئے آپ کو وقت نہیں ملتا ہے"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے پاس قصے کہانیوں کی کمی نہیں۔ انسان کی عمر جب بڑھ جاتی ہے تو مختلف تجربات اس کی زندگی کو بجائے خود ایک طویل داستان بنا دیتے ہیں۔ اگر مجھے تامل ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ قصے تم نوجوانوں کے دل کو کیا لبھا سکتے ہیں۔ کہ ان واقعات میں محبت و افسانے کی رنگینیاں ہوتی ہیں نہ حسن و شوخی کی دلفریبیاں"

میں بولی۔" بس آپ انہیں کو بیان کیجئے"

بھاپ اڑاتی ہوئی قہوہ کی پیالیاں ہاتھوں میں لے کر ہم نے سرکرسیوں کی پشت سے لگا دیئے۔

آتش دان میں لکڑیاں چیخ چیخ کر شرارے نکال رہی تھیں۔ باہر چھت پر بارش کی دھیمی دھیمی ٹپ ٹپ شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی سمندر پر بادلوں کے گرجنے کی خوفناک آواز آتی تھی۔

ڈاکٹر شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔" تم پسند کرو تو میں اپنے ایک تازہ مریض کی کہانی سناؤں جو پرسوں شام میرے پاس لایا گیا اور آج صبح ——"

"ضرور ——" میں اشتیاق سے اس کا منہ تکنے لگی۔

(۲)

ڈاکٹر گار نے قہوہ کا ایک گھونٹ لے کر کہا "پرسوں ایک عجیب کیس میرے پاس آیا روحی۔ بوڑھے احمد کو جانتی ہو؟ — گاؤں کی مسجد کا مجاور ہے۔ اس مسجد کے احاطہ میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے وہ اس کا بھی نگران تھا۔

"میں نے تو کبھی اس شخص کا نام نہیں سُنا"

ڈاکٹر کہنے لگا "اس کی موت کی وجہ نہایت عجیب ہے۔ پرسوں صبح وہ میرے پاس بیہوش لایا گیا۔ اور آج صبح اس غریب کا انتقال ہو گیا۔"

"خدا غریق رحمت کرے" میں نے کہا "کیا ہوا تھا ڈاکٹر؟"

"تم جانتی ہو کہ آج کل دیہات میں وبا بہت شدت سے پھیلی ہوئی ہے۔ دن کے وقت سڑکوں پر میت برداروں کے ہجوم گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بازار میں جدھر نظر ڈالو ادھر دو چار آدمی ایک جنازہ اٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رات آتی ہے تو دن سے زیادہ خوفناک مناظر پیش کرتی ہے۔ لوگوں کی خاموش ٹولیاں لالٹینیں لئے ہوئے قبرستان کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بوڑھا مجاور پرسوں رات کی سرگزشت اس طرح بیان کر رہا تھا۔

"دن بھر لوگوں کی تجہیز و تکفین میں لگا رہتا تھا۔ پرسوں رات تھک کر مسجد کے صحن کے ایک کونے میں پڑ رہا۔ دفعتاً کچھ آواز آئی اور میری آنکھ

کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ لالٹین لئے ہوئے مسجد کے صحن میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جنازہ ہوگا۔ رات اندھیری تھی، دُور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جنازہ کی نماز ختم بھی نہ کی تھی کہ بوندا باندی ہونی شروع ہوئی۔ تب میں نے اُن سے کہا کہ اب دفنانے کا انتظام کرنا بڑا مشکل ہے۔ میت کو یہاں رکھ دیجیے۔ میں سرہانے کلام مجید پڑھوں گا۔ صبح جب مینہ تھم جائے تو واپس آکر لاش کو دفنا دیجیے گا یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ برسات کے زمانے میں ہر دوسرے تیسرے ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں۔ میں رات تنہا لاش کے سرہانے کتاب مقدس پڑھنے میں صرف کر دیتا۔ کبھی کوئی ایسا واقعہ نہ گزرا تھا جو مجھے خوفزدہ کرتا۔

”غرض ان لوگوں نے جنازہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ اور مجھے کلام مجید پڑھنے کی تاکید کر کے مسجد کے صحن کے دروازے باہر سے لگا کر چلے گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دروازہ ان لوگوں نے باہر سے لگا دیا ہے یہ بعد میں معلوم ہوا۔

”ان لوگوں کے جانے کے بعد میں قرآن مجید کھول کر جنازے کے سرہانے بیٹھ گیا۔ رات بھیانک تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف کاجل کی

سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔کبھی دُور سے رونے کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔مجھ پر اب تک کوئی ایسا حادثہ نہیں گزرا تھا جیسا اس شب گزرا۔ ہولناک اور جان لیوا۔

تھوڑی دیر تو مَیں قرآنِ پاک پڑھتا رہا۔ پھر یکایک میری نظر سامنے کو اُٹھی اور میری رُوح کانپ گئی ـــــ مَیں نے دیکھا جنازے پر جو سفید چادر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ مَیں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ دل کو سمجھایا ـــــ ممکن ہے ہوا کا جھونکا ہو۔ یہ کہتا ہُوا مَیں پھر کتاب مقدس پڑھنے لگا۔ مگر قدرتی طور پر میری نگاہ بار بار اُٹھتی تھی۔ چادر برابر متحرک تھی۔ مَیں نے سمجھا ضرور کوئی بلّی جنازہ میں گُھس گئی ہے۔ باوجود اس یقین کے مَیں جنازہ کے قریب نہ جا سکا۔ ایک نامعلوم خوف دل و دماغ پر چھایا ہُوا تھا۔ مَیں اپنی عُمر میں کبھی نہیں ڈرا۔ یہ پہلا ہی موقع تھا، اور پہلا ہی حادثہ! ـــــ کچھ دیر بعد یہ حالت ہو گئی کہ چادر کا کونہ کونہ زور سے ہلنے لگا۔ جیسے کوئی جھنجھوڑ رہا ہو۔ اب تو میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میرا اُٹھنا ہی تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لاش پر پڑی ہُوئی چادر سرک گئی اور پھر ـــــ ایک کفن پوش سر آہستہ آہستہ جنازے میں سے اُٹھتا ہُوا نظر آیا۔ مَیں ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ یک لخت لاش جنازے میں

. . . .

میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل دو لمحے کھڑے رہے — مَیں اس کے کفن آلود چہرے کو تک رہا تھا — وہ میرے لرزتے ہوئے مجسّمے کو — پھر وُہ جنازے سے زمین پر کُود پڑا۔

"یہ دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں — میں دروازے کی طرف لپکا تاکہ سڑک پر نکل بھاگوں۔ مگر وہاں جا کر دیکھا تو دروازہ بند پایا۔ اس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ اندر صرف ہم دونوں مقیّد ہیں۔ قدموں کی آہٹ پا کر میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ میرے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ اور چونکہ اس کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ آہستہ آہستہ کُودتا ہُوا میرے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

"صحن میں امرود کا ایک درخت تھا۔ میں اُس کی طرف بھاگا۔ مگر اب شاید اس میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ وہ میرے تعاقب میں تیزی سے کُودتا ہُوا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ حالت تھی کہ ہم دونوں مسجد کے صحن کا چکّر لگا رہے تھے۔ مَیں آگے آگے اور وُہ پیچھے پیچھے۔ خوف نے میری تمام طاقتیں سلب کر لی تھیں۔ مَیں نہ چیخ سکتا تھا، نہ درخت پر چڑھ سکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب! میری حالت مُردے سے بدتر تھی۔ مَیں پاگل ہو رہا

تھا۔ مسجد کے صحن کی ہر دیوار کے قریب جا کر اُسے پھاندنے کی کوشش کرتا اور جب لاش میرے قریب آجاتی تو مَیں چیخ مار کر وہاں سے بھاگ نکلتا!

اسی وقت دفعتہً مجھے خیال آیا کہ پیچھے کنوئیں کے قریب کی دیوار کچھ گر پڑی ہے۔ اس کو پھاندنا نسبتہً آسان ہوگا۔ مَیں پچھلے حصّے میں جہاں دیوار کی چند اینٹیں گر پڑی ہیں بھاگ آیا اور اپنی پوری قوت اور کوشش سے دیوار پر سے پھاند گیا۔ مَیں ہانپ رہا تھا۔ اسی عالم میں پلٹ کر دیکھا تو لاش میرے تعاقب میں نہایت تیزی سے چلی آرہی تھی۔ آخر اس نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی مگر اینٹوں میں کفن اُلجھ گیا۔ اور مُردہ جسم دیوار پر نصف اِدھر نصف اُدھر لٹکنے لگا۔ اب وُہ بے جان معلوم ہو رہا تھا۔ مَیں باہر سڑک پر لڑکھڑاتا ہُوا پہنچا"

بس یہی صبح آنے جانے والوں نے مسجد کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر ایک لاش کو لٹکتا ہُوا دیکھا اور مجاور کو اُنھوں نے دیوار کے نیچے بے ہوش پایا۔

مجاور کا بھائی اُسے اُٹھا کر میرے پاس لایا۔ وہ تیز بخار میں پھنکا جا رہا تھا اور بے ہوش تھا۔ کل رات کے تین بجے اُس نے مجھے اپنی داستان سنائی اور آج صبح چل بسا۔ صبح دس بجے کے قریب وُہ لاش دفن کی گئی۔ اور دوسرے دن صبح دس بجے مجاور کی لاش بھی سپردِ خاک کر دی گئی

جنازہ

مَیں دم بخود ہو کر سُن رہی تھی۔ باہر آندھی زوروں پر تھی۔ آتش دان کی لکڑیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مینٹل پیس پر رکھا ہوا کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔

جب ڈاکٹر قصّہ ختم کر چُکا۔ تو مَیں لرزتی ہوئی اُٹھی اور اُس کے پہلو میں جا بیٹھی۔

کیپابوٹ کے آسیب زدہ جنگل

"باب الموت"

اخبارات میں نوجوان افراطی کی خوفناک اور پُراسرار موت کی خبر آپ کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ آج تک اُن کی موت پر طرح طرح کی حاشیہ آرائیاں ہو رہی ہیں۔

آپ کو کیپابوٹ کے سحرزدہ جنگلوں کے متعلق بھی خاص و عام سے مختلف قسم کی وحشتناک خبریں سننے کا اتفاق ہُوا ہوگا۔ اور ممکن ہے ان میں بہت سی باتیں ایسی ہوں جو صرف کہانیاں ہی نہ ہوں بلکہ چشم دید واقعات پر مبنی ہوں یا آپ بیتیاں ہوں۔ یہ وہی مقام ہے جس کے متعلق کپتان افراطی کی پُراسرار موت کے بعد حکومت "سلطانیہ" نے بڑے بڑے اعلان شائع کئے تھے کہ جو شخص اِن آسیب زدہ جنگلوں کے راز کو منکشف کرے گا اسے حکومت کی طرف سے کئی ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔

انہیں آسیب زدہ جنگلوں میں ایک خوفناک جنگل "باب الموت" کے

نام سے مشہور ہے۔ جہاں سے آج تک کوئی سیّاح زندہ واپس نہ لوٹ سکا۔
اور اسی مقام پر بدنصیب کپتان افراطی کی موت واقع ہوئی!
کپتان افراطی جیسے مشہور سیاح اور دلیر شکاری کا ان آسیب زدہ جنگلوں میں یوں آسانی سے موت کے گھاٹ اُتر جانا جہاں دُنیا کے لئے نہایت تعجب خیز تھا وہاں حکومتِ سلطانیہ کے لئے سخت الم انگیز تھا۔ کیونکہ کپتان افراطی کوئی معمولی سیاح نہ تھا۔ حکومتِ سلطانیہ کا یہ پہلا شہری تھا جس نے آثار وادیٔ شاہاں کے رازجویاؤں میں اپنا نام لکھوایا تھا جب اُن کی موت کی خبر اخباروں میں نکلی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شروع شروع میں پبلک کا خیال تھا کہ کسی درندے نے انہیں لقمۂ اجل بنا لیا ہوگا۔ مگر یہ کس قدر حیرانی کی بات تھی کہ کیسیابوت کے نواح کے باشندوں کا بیان تھا کہ وہاں کے جنگلوں میں شیر یا چیتا کبھی دیکھا ہی نہیں گیا۔ کسی نے یہ افواہ اُڑائی کہ باب الموت کی شیطانی حکومت نے انہیں مجنون بنا دیا۔ کسی نے کہا کہ وہاں کی کسی خبیث رُوح نے ان کا گلا گھونٹ ڈالا۔ غرض جتنے مُنہ اُتنی باتیں! مگر آج تک کوئی وثوق کے ساتھ نہ کہہ سکا کہ اُن کی موت کی اصل وجہ کیا ہوئی تھی؟
مرحوم کی وفات سے چند ہی ماہ پیشتر ۱۸۴۰ء کے موسم بہار میں میں اعصابی

کمزوریوں میں مبتلا ہوکر واپس وطن جا رہی تھی کہ اس سفر میں مرحوم سے میرا تعارف ہو گیا۔ کیونکہ وُہ بھی اسی جہاز پر سوار تھے۔ اور پھر بالکل حسنِ اتفاق سے اس مشہور شخص کی موت سے چند گھنٹے قبل مَیں اُن کے ساتھ تھی نیز بعد میں کیبابوت کے اسرار کی پردہ کشائی کی کوششوں میں بھی مجھے شامل ہونے کا اتفاق ہُوا تھا۔ لہٰذا اخبارات کے بعض نمائندوں اور بعض رفیقوں اور خصوصاً میرے مہربان طبی مشیر بوڑھے ڈاکٹر گارنے مجھے مشورہ دیا کہ مَیں کپتان افراطی کی عجیب موت اور کیبابوت کے آسیب زدہ جنگلوں کے صحیح اور چشم دید واقعات بغیر کسی قسم کی کمی بیشی کے قلمبند کر دوں۔ مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حیرت انگیز واقعات کو افسانے یا کہانی کے پیرائے میں کہنے کی بجائے اپنے اُن دنوں کے روزنامچے کے چند اقتباسات یہاں درج کر دوں۔ جو واقعات کو بغیر کسی قسم کی رنگ آمیزی کے صحیح ترتیب میں بیان کر سکیں گے:۔

۲ مارچ ۱۹۴۰ء

(ہمارا جہاز) "ریحانیہ" روز بروز زوحناک کے ساحلوں کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ خدا کرے وُہ دِن جلد آئے جب مَیں وطن پہنچوں۔ گو اعصاب سخت متاثر ہیں تاہم اِس سمندری سفر نے مجھے بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔

بوڑھے ڈاکٹر گار کو اجنبیوں سے راہ و رسم پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے میں اس فن سے قطعی لاعلم ہوں۔ آج دوپہر سخت گرمی تھی اور ہوا بالکل بند تھی۔ اس لئے میں عرشۂ جہاز پر نکل آئی۔

ایک ڈیک چیئر پر بیٹھی اپنے ایک نامکمل ناول کا مسودہ دیکھ رہی اور سبز موجوں کی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر گار ایک اجنبی کو لئے میرے پاس آ گیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ کپتان افراطی ہیں۔ مشہور سیاح اور ماہر شکاری۔ حال ہی میں اُن کی ایک ضخیم کتاب مع تصاویر کے "درندوں کی زندگی" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہایت شوق سے ان سے ملاقات کی اور اُن کے سفر کے حالات پوچھے۔ نہایت دلچسپ آدمی ہیں، اور کئی خوفناک سفر کر چکے ہیں!

۵ مارچ ۱۹۳۰ء

گرمی خوشگوار ہو گئی ہے۔ تاہم ہم لوگ دن بھر عرشۂ جہاز پر رہتے ہیں۔

یا تو میں اپنے اعصاب کی وجہ سے جہاز پر اُکتائی اُکتائی رہتی تھی، یا اب جب سے کپتان افراطی سے ملاقات ہوئی ہے سفر دلچسپی میں کٹنے لگا ہے!

۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء

کپتان افراطی سے ملنے کے بعد کہانیوں کے کئی پلاٹ میرے ذہن میں گشت لگاتے رہتے ہیں۔ یہ گرم و سرد چشیدہ شخص اپنی سیر و سیاحت کے سنسنی پیدا کرنے والے واقعات ہر روز گھنٹوں بیان کرتا ہے اور ان کا ذخیرہ کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ کل رات میں اور ڈاکٹر گار عرشۂ جہاز پر ڈیڑھ بجے تک تاروں کی چھاؤں میں بیٹھے کپتان افراطی سے ان کے افریقہ کے سفر کے حالات سنتے رہے۔ نیند پر لگا کر اُڑ گئی تھی اور کہانی کا سحر ہم پر پوری طرح طاری تھا۔ اگر مجھے پہلے خیال آ جاتا تو میں ان واقعات کو اپنی طرز میں قلمبند کرنا شروع کر دیتی۔ کپتان افراطی ہی کے سادہ اور بے ساختہ انداز میں لکھے جاتے جب بھی ان واقعات کا مجموعہ اپنی دلچسپی میں کسی ناول سے کم ہرگز قرار نہ دیا جا سکتا۔ اگرچہ میں نے خود خوفناک سفر کئے ہیں۔ دریائی بھی، ہوائی بھی۔ مگر اُن کی سیاحت کے قصے سُن کر عش عش کرنے لگی ہوں۔

آج میں اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو لئے ایک ڈیک چیئر پر نیم دراز اوڈی کولون سُونگھ رہی اور لیموں کی کلیوں کی چاء پی رہی تھی کہ کپتان افراطی میری طرف آ گئے۔ باتوں باتوں میں خدا جانے محض تکلفاً یا قصداً اُنہوں

نے اپنے آیندہ کے ایک دہشت ناک سفر میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی۔
انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دفعتہً مجھ سے سوال کیا: "آپ کو کیمیا بوت کے سحر آلود جنگلوں کے متعلق کبھی کچھ پڑھنے یا سننے کا اتفاق ہوا ہے خاتون روحی؟"
کیمیا بوت کا نام سن کر میں لرز گئی۔ "جی ہاں۔ جی ہاں" میں نے کانپ کر کہا۔
کپتان افراطی ہنس پڑے۔ بولے "پھر؟ آپ نے کبھی اس کا سبب دریافت کرنا نہیں چاہا کہ لوگ وہاں جا کر واپس کیوں نہیں لوٹتے؟"
"میں کیا بتاؤں کپتان؟ میں نے تو یہی سنا ہے کہ وہ جنگل آسیب زدہ ہیں۔ وہاں کے سحر کے مقابل میں انسانی عزم و استقلال بے بس ثابت ہو جاتا ہے۔ آج تک کوئی انسان وہاں جا کر واپس نہیں آیا۔ اسی لئے تو وہاں کے جنگل "باب الموت" کہلاتے ہیں۔"
کپتان افراطی مسکرانے لگے، پھر بولے۔ "خاتون شاید آپ کو حیرت ہو کہ اس سال میں کیمیا بوت کے جنگلوں میں جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔"
"اُف معبود" میرے منہ سے نکلا۔ اور نیبو کی کلیوں کی چاء کا ایک گھونٹ لے کر جملہ میں نے ختم کیا: "اپنے اس خوفناک ارادے سے باز آ جائیے۔"

مگر کپتان کہنے لگا۔ "میرا تو مصمم ارادہ ہو چکا ہے خاتون۔ یہ میری زندگی کی تمناؤں میں سے ایک ہے۔ اور اب اس تمنا کو میں ارادہ بنا چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں میں "باب الموت" کے متعلق جو غلط اور پُراسرار افواہیں مشہور ہیں کہ وہاں کے پتے پتے پر سحر کیا گیا ہے یا بدرُوحوں نے وہاں اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے اور وہاں کسی انسان کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا، انہیں ہمیشہ کے لئے دُور کر دوں تاکہ اِن توہمات کا خاتمہ ہو جائے۔"

میں اس کی ہمت پر عش عش کرنے لگی۔ "مبارک خیال ہے۔ یہ تو ایک کارنامہ ہوگا۔ میں خود کئی دفعہ دَورانِ سیاحت میں خانہ بدوشوں کے جزیروں میں پھنس چکی ہوں۔ صحارا کے صحراؤں میں بھی ایک دفعہ مجھے ٹھہرنا پڑا۔ مگر یہ سب کچھ اتفاقاً ہُوا نہ کہ قصداً اور ارادۃً۔ کئی دفعہ میرا ہوائی جہاز بگڑ گیا اور مجھے مجبوراً خوفناک جنگلوں میں اُترنا پڑا۔ اگر آپ زندہ آ گئے تو انشاءاللہ میں بھی کبھی ان عجیب و غریب جنگلوں کی سیاحت کے لئے نکلوں گی۔ کئی دفعہ خیال ہُوا کہ ہوائی جہاز میں اس جنگل کے گرد گھوم آؤں۔ لیکن سُنا ہے کہ یہ کوشش بے سُود ثابت ہو چکی ہے وہاں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ درخت اتنے گھنے ہیں کہ زمین پر نظر نہیں پڑ سکتی۔ پھر پہاڑ اتنے بلند ہیں کہ ہوائی جہاز ہر وقت ٹکرا کر چُور چُور ہو

سکتا ہے۔"

"آپ میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں خاتون رُوحی ؟" کپتان نے دفعتہً سوال کیا۔

اِس سوال پر مجھے ایک اندرونی مسرّت کا احساس ہُوا۔ تاہم ذرا سے تامّل کے بعد بولی: "میں سیاحت سے تو نہیں گھبراتی البتہ "بابُ الموت" کے سلسلے میں جو دہشت خیز خبریں اخباروں میں گزشتہ سال پڑھی ہیں اُن کی وجہ سے تامّل سا ہوتا ہے۔ اور پھر اس بارے میں میرے اعصاب بھی مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ سا تجربہ کار سیاح مجھے اس سفر میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تو مجھے اصُولاً انکار نہیں کرنا چاہیئے میں تو اسے اپنی خوش بختی سمجھوں گی۔ اچھا اگر آپ روانگی سے چند ہفتے قبل مجھے اطلاع بھیج دیں تو ممکن ہے کہ میں چل سکوں۔ آپ کب تک روانہ ہونا چاہتے ہیں ؟"

کپتان افراطی نے مستعدی کے لہجے میں کہا: "بس اپریل کے اخیر یا مئی کے شروع میں ——"

"اتنی جلدی ؟" میرے مُنہ سے نکلا۔

"جی ہاں، جس وقت میری طرف سے آپ کو اطلاع پہنچے اسی ہفتے

آپ چل پڑیئے گا۔"

"بہت اچھا" مَیں نے کہا۔

مجھ سیر و سیاحت کی دلدادہ عورت کے لئے اس سے بہتر موقع اَور کیا ہو سکتا تھا کہ کپتان افراطی جیسے مشہور سیاح کی رفاقت میں سفر کی عزت حاصل ہو؛ خیالی دُنیا میں آج تمام دن مَیں اپنے سیاحت نامے کا اِک نیا اور دلچسپ باب مرتّب کرتی رہی۔

ہماری باتوں کے دَوران میں بُوڑھا ڈاکٹر گار اپنی نسوار کی ڈبیا بر حسب عادت چٹکی بجاتا ہؤا ٹہلتا ٹہلتا ہمارے قریب آیا اور بولا "مَیں مخل تو نہیں ہؤا؛ میرا خیال ہے یہاں حسب معمول جنگلوں اور صحراؤں کی سیاحت کا ذکر جاری ہوگا؛"

"ہاں" مَیں نے کہا "ڈاکٹر تم نے سُنا؛ آیندہ کپتان افراطی کا ارادہ باب الموت کے اسرار کو معلوم کرنے کا ہے۔"

"یا معبود تیری پناہ!" کیسابوت کے نام سے بوڑھے ڈاکٹر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ گزشتہ سال وُہ اخبارات میں اس سلسلے میں جانے والوں کی اموات کی فہرست نہایت باقاعدگی سے پڑھتا رہا تھا۔ کسی قدر سہم کر کہنے لگا "نوجوان کپتان! کیا اپنی زندگی سے بیزار

ہو چکے ہو؟"

میں ہنس پڑی۔" اور تم نے یہ نہیں سُنا، کپتان صاحب نے ازراہِ نوازش اس سفر میں مجھے بھی مدعو کیا ہے، اور میں نے وعدہ بھی کر لیا ہے کہ ان کے ساتھ چلوں گی۔"

"عجیب خیالات ہیں۔" بوڑھے ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔" میں تو کیمیا بوت کا نام سُن کر لرز جاتا ہوں۔ کیا زندگی اتنی ارزاں چیز ہے بیٹی رُوحی؟"

"نہیں ڈاکٹر" میں کہنے لگی۔" جبھی تو ہم اسے ایسے قیمتی کاموں میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔ فرائض لامحدود ہیں اور زندگی محدود! لہٰذا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گنوانا چاہیے۔ کپتان صاحب وہاں جا کر ان توہمات کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو عام طور پہ باب الموت کے متعلق مشہور ہیں۔ افضل الشغل من النّاس۔"

مگر ڈاکٹر گار ان باتوں سے بے چین ہی رہا۔

۱۲ اپریل ۱۹۴۰ء

آج کی ڈاک میں کپتان افراطی کا خط وصول ہُوا۔ اُسے دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ انسانی ارادہ چٹان کی طرح مضبوط اور اٹل ہوتا ہے۔ اِس

خط نے میرے تمام پروگرام تلپٹ کر ڈالے۔ اُس نے لکھا ہے :۔

"اتفاق سے باب المرت کے سفر کا پروگرام وقت سے
کسی قدر پہلے بن گیا ہے۔ چونکہ آپ نے وہاں کے سفر کا
نہایت اشتیاق ظاہر کیا تھا اور مجھ سے ازراہِ عنایت وعدہ
بھی کر لیا تھا کہ آپ اس سفر میں میرے ساتھ چلیں گی اِس لئے
ملتجی ہوں کہ آپ ایک ہفتے کے اندر اندر تیار ہو جائیں،
اور بندرگاہ کیباپوت پر مجھے آملیں۔"

اِس خط کو دیکھ کر میں مجبور ہو گئی کہ جس نامکمل افسانے کی تکمیل میں
اِن دنوں میں مصروف ہوں اُسے کسی دُوسرے وقت کے لئے اُٹھا رکھوں

۲۲ر اپریل ۱۹۵۰ء

تمام دن اسبابِ سفر کی درستی میں منہمک رہی ہوں۔ دماغ تھکا را سا گیا ہے
ڈر ہے کوئی ضروری چیز اسبابِ سفر میں باندھنا بھول نہ گئی ہوں۔ نامکمل
افسانوں کے مسودے اور ملبوسات کے علاوہ اس دفعہ کے سامانِ سفر
میں میں نے دواؤں کا بیگ بھی شامل کر لیا ہے۔ کل سویرے انشاءاللہ
میں کیباپوت کی طرف روانہ ہو جاؤں گی۔

میری بوڑھی حبشن زوناش اس سفر سے نہایت خفا ہے۔ اسے خفا

رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ بوڑھی مسخری بڑھیا!

آج میں نے ڈاکٹر کو ایک مفصل تار دیا اور التجا کی کہ وہ راستے میں بندرگاہ "فورغ" پر مجھ سے آ ملے۔ اور اگر اس کی ہمت ساتھ دے تو اس سفر میں میرے ہمراہ چلے۔ مگر مجھے توقع کم ہے کہ ڈاکٹر گار جیسا وہمی آدمی اس سفر پر کمربستہ ہو سکے۔

۲۵ ۔ اپریل سنہ ۴۰ء

پرسوں صبح سے میں لامحدود آسمانوں کی نیلاہٹ، اور لامحدود سمندر کی نیلی موجوں کی موسیقی میں پھر گم ہوں۔

آج صبح ۷ بجے ہمارا جہاز "فورغ" کی ناریل کے لمبے لمبے درختوں سے ڈھکی ہوئی ننھی سی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اُس وقت میں مصروفِ خواب تھی۔ یکلخت آواز آئی "روحی!" اور میں چونک پڑی۔ آنکھ کھولی تو سامنے بوڑھا ڈاکٹر گار! میں اُسے دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اُٹھتے ہی اُس سے چمٹ گئی۔

"میں تمہیں اس سفر سے منع کرنے آیا ہوں۔" ڈاکٹر گار نے کہا۔ "ایک تو تمہارے اعصاب کی یہ حالت، اس پر طرّہ کیمیا بوت کے آسیب زدہ جنگلوں کا سفر!"

اپنے آپ کو میں مجرم سی محسوس کرنے لگی۔ بات ٹالنے کو بولی: "وہ دُور ساحل پر ناریل اور تاڑ کے حسین درختوں کو دیکھ رہے ہو؟"

ڈاکٹر گار بولا: "ہاں دیکھ رہا ہوں۔ اور اسی ساحل پر تمہیں میں اپنے ساتھ اُتاروں گا۔"

"نہیں ڈاکٹر نہیں ـــــ میں ارادہ کر چکی ہوں۔ اور تم میرے ارادوں سے واقف ہو! میں تمہیں ساتھ چلنے پر مجبور تو نہیں کرتی۔ مگر کیا اچھا ہو اگر تم ـــــ"

ڈاکٹر گار کے لہجے میں مایوسی سی آگئی۔ "زوجی ضد ہمیشہ اچھی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھے ان صحراؤں میں دفنانا چاہتی ہو۔"

"کن صحراؤں میں ڈاکٹر؟ کیبا بوت کے؟ توبہ توبہ! دفنائے جانے کا تصور بھی نہ کرو۔ انشاءاللہ ہم زندہ اور کامیاب واپس آئیں گے۔ ناشتہ نوش کرو۔ نیبو کی کلیوں کی چاء؟ ـــــ جہاز کے چھوٹنے میں نصف گھنٹے کی دیر ہے۔"

ڈاکٹر گار نے ناشتہ کیا اور اس تمام وقت میں مجھے کیبا بوت کے جنگلوں سے متوحش اور خوف زدہ کرنے کی کوششیں کرتا رہا۔

آخر جب جہاز نے سیٹی سجائی تو میں نے کہا: "ڈاکٹر خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" ڈاکٹر گار نے کسی قدر خشکی سے کہا اور یکلخت مُڑ گیا۔
پھر لمحہ بھر ساکت کھڑا کچھ سوچتا رہا۔
ناگہاں کہنے لگا: "تمہاری ضد ناک چنے چبوائے گی۔ معلوم ہوتا ہے
کہ میرا پیمانۂ زندگی چھلک پڑنے کو ہے۔"
"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔
"کیوں کیا؟ میں تمہارے ساتھ چلوں گا اور خدا علیم ہے کہ وہاں
کن کن مصائب کا سامنا کرنا ہو گا!"
مجھے مطلقاً توقع نہ تھی کہ ڈاکٹر گار میرے ساتھ زحمتِ سفر برداشت
کرنے پر آمادہ ہو جائے گا، ویسے ہی میں بچپن سے اس پیارے بوڑھے
کی قدر داں ہوں مگر اس وقت کی اس محبت نے مجھے اس کا گرویدہ بنا
دیا۔ ڈاکٹر گار کی رفاقت نے سفر کی زحمت و وحشت کو بالکل مٹا دیا۔
اور میں تقویت سی محسوس کر رہی ہوں۔
تمام دن موسم نہایت خوشگوار رہا اور جہاز کی رفتار قابلِ اطمینان!
آج میری طبیعت بھی بشاش رہی، البتہ زوناش حسبِ معمول افیون
کھاتی اور بڑبڑاتی رہی۔

۲۶ر اپریل سنہ ۴۰ء

بارے آج ہمارا جہاز ساڑھے آٹھ بجے کے قریب بندرگاہ کیمیا بوت میں داخل ہو گیا۔

کپتان افراطی میرے منتظر تھے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر گار کو دیکھ کر انہیں ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ کہنے لگے: "خاتون رُوحی کی ہمت قابلِ صد ستائش تو تھی ہی، لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ نے کمال کر دیا ——"

"میں نے کیا کمال کیا یہ خاتون رُوحی کا حکم ہے۔" ڈاکٹر گار اب تک کچھ ناراض ناراض سا نظر آ رہا تھا۔

"ڈاکٹر! خدا کے لئے اب غصّہ تھوک دو۔ دیکھو اب تو سفر بھی ختم ہو گیا۔"

"ختم ہُوا کہ اب شروع ہوا ہے۔" ڈاکٹر کہنے لگا۔

"جو چیز شروع ہوئی وہ ختم بھی ہو جائے گی" کپتان افراطی کہنے لگے۔ غرض ہم دونوں نے ڈاکٹر کو بہلا پھسلا کر ٹھیک کیا۔ کپتان افراطی ہمیں اپنے ہوٹل لے گئے جو بالکل سمندر کے کنارے آباد تھا۔

ہم نے وہاں پُرتکلف ناشتہ کیا۔ چونکہ دوپہر کو وقت پر کھانا ملنے کی اُمید موہوم تھی۔ اِس لئے ناشپاتی اور اناس ساتھ رکھ لئے۔ ناشتے کے بعد ایک لمبی سی کار میں سوار ہو کر جنگلوں کا راستہ طے کرتے ہُوئے ظہر

کے وقت باب الموت کی پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے کھانا کھایا۔

یہاں ہمیں کار چھوڑ دینی تھی اور پہاڑی راستہ پر روانہ ہونا تھا۔ لوگ یہاں سے یا تو خچروں پر سفر کرتے ہیں یا خانہ بدوشوں کی ڈانڈیوں پر۔ ڈانڈی کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ جنازے کا خیال آجاتا ہے۔ اِس لئے مَیں نے ڈانڈی میں سوار ہونے کی مخالفت کی۔

"نہیں —— مَیں تو ڈانڈی میں بیٹھوں گا!" ڈاکٹر گار نے ضد کی۔ مَیں نے بھی مصلحتِ وقت کو مدِنظر رکھ کر اس دفعہ اُس کی مخالفت نہ کی اور نہایت فرماں بردارانہ انداز سے بادلِ ناخواستہ ایک ڈانڈی میں سوار ہو گئی۔ اور اس طرح ہمارا مختصر سا قافلہ پہاڑی ناہموار اور ویران راستوں کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر گار بھی مزے میں آکر مثنوی مولانا روم نہایت دلپذیر انداز میں پڑھنے لگا۔ جسے سُن کر کپتان افراطی نے بھی اپنی رفتار کم کر دی۔ اور ڈاکٹر کی ڈانڈی کے قریب خچر لاکر کہنے لگے "ڈاکٹر آپ نے تو سماں باندھ دیا!"

ڈاکٹر اپنی تعریف سُن کر ہمیشہ خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ مزے میں آکر

زور زور سے گانے لگا۔
کبھی کبھی دُور کسی پہاڑ کی چوٹی پر سے کسی پہاڑی دوشیزہ کا جنگلی گیت سُنائی دے جاتا۔ کبھی کسی خانہ بدوش کی بانسری کی سریلی تان، درختوں کے پتوں کی سنسناہٹ، پہاڑی نامعلوم راستوں کی ناہمواری، خانہ بدوشوں کے غیر مانوس لہجوں کی گونج۔ یہ سب کچھ اس قدر خوابناک تھا کہ میں حقیقت کو بھول کر خوابوں کی وادی کا تصوّر کرنے لگی۔
آخر پہاڑ کے عقب سے چاند نکلنے لگا اور راستے نہایت خوفناک نظر آنے لگے۔ ابھی ہم چاند کی لطیف روشنی کو محسوس ہی کر رہے تھے کہ یکلخت سامنے سے کچھ خانہ بدوش آتے نظر آئے اور ہماری ڈانڈیاں رُک گئیں۔
"کیوں بھئی کیا ہوا؟" گارگانا وانا بھول کر سہم سا گیا اور پوچھنے لگا۔
"کچھ نہیں حضور!" ڈانڈی لے جانے والے خانہ بدوش نے جواب دیا۔ "یہ چند دوست راستے میں مل گئے ہیں۔ ان سے باتیں کرنی ہیں۔"
"یہ کہاں سے آرہے ہیں؟" کپتان افراطی نے اپنا خچر روک کر پوچھا۔
"باب الموت کی طرف سے۔"
"کیا باب الموت کے اندر گئے تھے؟"

یہ سُن کر خانہ بدوش ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔ ”کوئی اندر جا کر باہر بھی آیا ہے؟
آج تک کوئی سیاح واپس نہیں لوٹا۔ خود ہم نے ان ہی ڈانڈیوں میں کئی
سیاحوں کو سوار کیا، اور باب الموت کی آخری منازل پر چھوڑ آئے۔ مگر پھر
ہم نے کبھی اُن کی شکل نہیں دیکھی!“ یہ کہہ کر اور ذرا دیر سامنے سے آنے
والے خانہ بدوشوں سے باتیں کر کے وہ ہماری ڈانڈیاں لے کر روانہ ہو گئے
ہم تینوں پر عجب قسم کی اُداسی مسلط ہو گئی۔ کیا موت کی بے پناہ
کشش ہمیں کھینچ کر وہاں لے جا رہی تھی؟ کیا یہ واقعی ڈانڈیاں نہیں
بلکہ جنازے تھے؟ میں نے اپنے دستی بٹوے میں سے اوڈی کولون الکحلہ
کی شیشی نکالی اور سونگھنے لگی، کیونکہ دہشت نے میرے اعصاب سُن سے
کر دیئے تھے۔

نہ معلوم ہم سب کب تک خاموش رہے! بڑی دیر بعد دیکھا، تو
آسمان پہ گونگے چاند کا چہرہ زرد نظر آیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد دُور گنجان درختوں
سے ڈھنپے ہوئے اُونچے اُونچے پہاڑ اِک پُراسرار سکوت میں چُپ چاپ
کھڑے نظر آنے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ موت کے فلسفہ کو جانتے
ہوئے بھی گُنگ ہو گئے ہیں!

آخر جنگل بڑھتا بڑھتا ایک میدان تک آ پہنچا۔ اس جنگل کے کنارے

پر کپتان افراطی کے ملازموں نے خیمے نصب کر دیئے تھے۔ یہی ہماری منزل تھی۔

ڈانڈیوں سے اُترتے ہی ہم نے نیبو اور انناس کا رس چاء میں ڈال کر پیا۔ اور خیموں کے اندر گئے۔ یہاں ملازموں نے الف لیلہ کی سی قندیلیں جلا رکھی تھیں جن کے فانوس زرد اور سُرخ تھے۔ زوناش نے فوراً قرآن مجید کھولا اور موم بتی کی روشنی میں بآوازِ بلند اس کی آیتیں پڑھنے لگی۔ ہر طرف ایک دہشت اور افسردگی مسلّط تھی۔

"آخر ہم اپنی منزل پر پہنچ ہی گئے!" کپتان افراطی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

مگر اُس شب کھانے پر موم بتی کی تیز زرد روشنی میں مَیں نے اچھی طرح دیکھا کہ کپتان افراطی کا چہرہ اُترا ہوا ہے۔ اُنہوں نے کھانا بہت کم کھایا۔ حالانکہ ہرن کا گوشت بھُنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر گار کی یہ مرغوب غذا تھی اس لئے اُس نے خوب کھایا۔ اس پر نیبو کا رس پیا۔ مَیں نے ترش نارنگی کے رس میں پنیر کے چند ٹکڑے بھگو کر کھائے اور مصنوعی حرارت سے پکی ہوئی نارنگیاں۔

کپتان افراطی کل صبح باب المونت روانہ ہو جائیں گے جو یہاں سے

صرف چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آگیا تو اُن کی مدد کے لئے ہم روانہ ہو جائیں گے !!

۲۷ر اپریل سنہ ۴۰ء

آج صبح کے ناشتے کی میز پر کپتان افراطی موجود نہ تھے۔

جب مَیں اُن کے خیمے کی طرف گئی تو وہ جنگل کے رُخ مُنہ کئے کھڑے تھے۔

"صباح الخیر کپتان افراطی۔ مزاج شریف؟"

وہ مُسکرائے "نوازش!"

مَیں نے کہا "آپ پژمُردہ نظر آتے ہیں۔ حالانکہ آج آپ کے سفر کا دِن ہے۔"

وہ مستعدی سے بولے "میرے سفر میں کوئی چیز سدِّ راہ نہیں بن سکتی خاتون رُوحی چہ جائیکہ میری پژمردگی۔ مَیں آج ضرور روانہ ہو جاؤں گا۔ رات میں نے ایک وحشت ناک سا خواب دیکھا تھا، اسی لئے کسی قدر متاثر تھا"

"کیا خواب تھا؟" مَیں نے پُوچھا۔

کپتان کہنے لگے "شب گذشتہ مَیں نے خواب دیکھا کہ میرا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے" یہ کہہ کر وہ اُداسی کے عالم میں مسکرانے لگے۔

مَیں چُپ ہو گئی پھر کچھ وقفے کے بعد بولی۔ "تو گویا رات بھر آپ

کی نیند بے چین رہی !"

"جی نہیں ——— بدخوابی تو نہیں رہی - البتہ اس پوسٹ مارٹم کے نظارے نے کچھ مضمحل کر دیا"

میں کہنے لگی - "خواب کا مستقبل سے رشتہ نہیں ہوتا - البتہ اس کی نفسیاتی تعبیر یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کی اپنی تمنا یہ ہے کہ اس سفر میں آپ مصائب میں گرفتار ہو جائیں، پھر آپ کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو - یہ محض آپ کی اپنی خوابیدہ خواہشات کا ہلکا سا عکس ہے جو آپ نے عالم رویا میں دیکھا ہے - محتاط رہیئے - اور اپنے آپ پر کسی قسم کی مصیبت کو حتی الامکان نہ آنے دیجیئے - کیونکہ مصائب و آلام کا شکار ہونا یا نہ ہونا بہت کچھ انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے - اپنے آپ کو ایذا پہنچانے کی خواہش ہر انسان میں نامعلوم طریق پر موجود ہوتی ہے - اس لئے آپ کو چاہیئے کہ اس مہم پر جانے سے پہلے اپنی اس خواہش سے محتاط رہیں اور اپنے آپ کو گرفتارِ بلا ہونے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں - باقی رہا آپ کا خواب، تو اس کا مستقبل سے اُس وقت تک کوئی تعلق نہیں ہو سکتا - جب تک آپ کا اپنا ارادہ اس بات کا نہ ہو کہ خواب کو سچا کر دکھائیں"

کپتان افراطی نے ایک لمبا سانس لیا "آپ کی باتوں سے میری تشفی

سی بدقسمتی سے خاتون زوجہ میں کوشش کروں گا کہ اپنا دشمن آپ نہ بنوں۔"

اسی وقت ڈاکٹر گار اپنے خیمے میں سے نکل آیا۔ اور ہماری باتوں میں شریک ہو گیا اور طبی انداز کی گفتگو شروع کر دی۔ "شاید مچھروں نے آپ کو سونے نہیں دیا۔ کونین کھائیے اور آج کا سفر ملتوی کر دیجیے۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" کپتان افراطی کہنے لگے۔ "اگر میں آج نہ گیا تو پھر کبھی نہ جا سکوں گا۔"

اس گفتگو کے بعد ہم نے چائے پی۔ چائے کے بعد کپتان افراطی اپنے خیمے میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد شکاری لباس زیب تن کئے لوٹ آئے۔ اس وقت اُن کا چہرہ بہت بشاش نظر آ رہا تھا۔ کہنے لگے۔ "میں آج باب الموت کی دوسری منزل پر پہنچنے کی کوشش کروں گا اور پوری امید ہے کہ کل دوپہر تک باب الموت کے اندر داخل ہو کر وہاں کے حالات معلوم کر سکوں گا۔ آپ لوگ پرسوں صبح میرا انتظار کریں۔"

ہم دونوں نے کپتان افراطی کو دلی دعائیں دیں۔ بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی سنبھال کر اُنہوں نے ہم سب سے باری باری مصافحہ کیا۔ اور جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں، ڈاکٹر گار اور سب ملازم اور کئی خانہ بدوش بھاری دل اور ملول نظروں سے انہیں اُس وقت تک تکتے رہے

جب تک کہ جنگل کے اندھیرے نے انہیں ہماری نظروں سے اوجھل نہ کردیا ۔ اُس وقت خانہ بدوشوں نے اِک پہاڑی گیت شروع کردیا جس کو سُن کر ہمیں بے چین ہوگئی ۔ یہ درد وغم میں ڈوبا ہُوا نغمہ تھا ۔ جب ہم نے اس موقعہ پر گانے کی وجہ پوچھی تو خانہ بدوشوں نے کہا کہ اس گیت کا نام "موت" ہے اور جب کوئی سیاح اِن جنگلوں میں جانے لگتا ہے تو اُس وقت یہ گیت گایا جاتا ہے ۔

۲۶ر اپریل ۴۰ء

کل جب سے کپتان افراطی گئے ہیں میرے اعصاب متأثر ہو گئے ہیں ۔ خصوصاً آنکھوں پر اس کا اثر ہے ۔ مَیں نے صبح اِک اعصابی دوا کی ٹکیہ گھول کر پی اور اوڈی کولون سے سر دھویا ۔ دن بھر ہم سب ایک عجیب خلش اور اُلجھن میں گرفتار رہے ۔ مجھ میں اور ڈاکٹر گارمیں سکوت کے لمبے لمبے وقفوں کے ساتھ انہیں کی باتیں ہوتی رہیں ۔ فکر اور تردّد اِک بوجھ کی طرح سینے پر رکھا ہُوا ہے ۔

کپتان افراطی کے خواب کا مجھے کئی دفعہ خیال آتا رہا ۔ جب انسان کا اپنا ارادہ اپنے آپ کو ایذا پہنچانے کا ہو جائے ، تو پھر کوئی بالائی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ۔ یہی اس خواب کی تعبیر ہے !

۲۸ر اپریل ۱۹۴۰ء

آج کپتان افراطی کی واپسی کا دن تھا۔ ہم دونوں صبح سے جنگل کے راستوں کو منتظر اور مشتاق نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پورا دن اُنہیں کے انتظار میں گزر گیا۔ مگر وُہ نہ آئے!

آخر آفتاب غروب ہوگیا۔ اور اشجار کے زیرِ سایہ تاریکی نہایت دہشت ناک نظر آنے لگی۔ مگر بدنصیب مسافر کا کوئی سُراغ نہ مِل سکا!

یا الٰہی! کیا واقعی کیبا بوٹ کے جنگل سحر زدہ ہیں؟ کیا "باب الموت" واقعی انسان کی موت کا دروازہ ہے؟ کیا بدنصیب کپتان اب کبھی واپس نہیں آئے گا؟ یہ سوال ہیں جو میرا دھڑکتا ہوا دل بار بار مجھ سے پُوچھ رہا ہے!

۲۹ر اپریل ۱۹۴۰ء

شب گزشتہ بدخوابی نے متوحش رکھا۔ نہ میں سو سکی نہ ڈاکٹر گار! چاند جنگل کے ہولناک راستوں پر نوُر کی چادر پھیلاتا رہا اور پہاڑی گِدھ زور زور سے کراہتا رہا۔ میں اور ڈاکٹر گار اپنی سفری چارپائیوں پر لیٹے کپتان کے متعلق چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ ذرا سا کھٹکا ہوتے ہی ہماری منتظر نگاہیں اضطرارانہ انداز میں اُس راستے کی طرف اُٹھ جاتیں جس پر جا کر آج تک کوئی مسافر واپس نہیں آیا۔

آج کا تمام دن انتظار اور مایوسی کی کشمکش میں کٹ گیا۔ ڈاکٹر گار نے مجھے دوا بدل کر دی، جسے پی کر میں غنودگی سی محسوس کرنے لگی۔ اور دیر تک لحافہ سوتھتی رہی۔

۳۰ر اپریل سنہ ۴۰ء

آج ہم نے کئی خانہ بدوش جنگلیوں کو بھاری انعاموں کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ باب الموت کی طرف جا کر کپتان افراطی کا پتہ لگائیں۔ ڈاکٹر گار نے دمکتے ہوئے چاندی کے سکّے بھی دکھائے۔ ان سے تشفّی نہ ہوئی تو سنہری اشرفیاں بھی دکھائیں کہ اُن کی لالچی طبیعت اِدھر مائل ہو۔ مگر بے سُود!! ہماری تسلّی کے لئے یہ لوگ کپتان افراطی کی تلاش میں صرف اِس درّہ تک جانے کو آمادہ ہیں جس کی چڑھائی کے بعد "باب الموت" کا صرف راستہ نظر آتا ہے۔ اور جس کی دوسری طرف کیسابو کے آسیب زدہ جنگل کھڑے انسانی فہم اور زندگی کی ہنسی اُڑا رہے ہیں! مگر باب الموت میں داخل ہونے پر کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ ہم نے ان خانہ بدوشوں کو چڑھائی تک روانہ کر دیا ہے۔

یکم مئی سنہ ۴۰ء

کپتان افراطی کی واپسی کی اُمیدیں منقطع ہو گئیں! اب وہ کبھی واپس

نہیں آنے کے! جن خانہ بدوشوں کو ہم نے ورسے کی چڑھائی تک بھیجا۔ وہ ناکام واپس آگئے!

میرے اعصاب سخت متاثر ہیں۔ اور اعصابی دواؤں کی تیزی سے تمام وقت غنودگی سی محسوس کرتی رہی۔ آنکھیں دھندھیائی ہوئی ہیں اور سر میں کچھ درد محسوس ہو رہا ہے۔

۲ رمئی سنہ ۱۴ء

آج کپتان افراطی کو سفر موت پر روانہ ہوئے دونوں گزر گئے۔ اب اس عدم کے مسافر کا انتظار اس دنیائے آب و گل میں فضول معلوم ہوتا ہے۔

گزشتہ دو دن میں علیل رہی اور آج پہلی دفعہ بستر سے اٹھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ پچھلی کئی راتوں میں مجھے وحشت اور بدخوابی کی شدید تکلیف رہی ڈاکٹر گار نے اعصاب کو سکون کرنے کے لئے ملر گال کی اکٹھی تین ٹکیاں پانی میں گھول کر پلائیں۔ اور اوڈی کولون سے روزانہ غسل کرنے کی ہدایت دی۔

آج صبح خیمے سے باہر پہاڑی ہوا کھانے کے لئے نخلینہ شوگفتی ہوئی ڈک چیئر پر لیٹی ہوئی تھی اور ڈاکٹر گار میرے قریب ہی بیٹھا اک طبی کتاب میرے متعلق پڑھ رہا تھا کہ یکلخت اس نے کہا "روحی۔ اب ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہئے"

مَیں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "اور کپتان افراطی؟"

ڈاکٹر گار پژمردہ آواز میں کہنے لگا۔ "آہ! اگر انتظار مسافرانِ عدم کو لوٹا لانے کی تاثیر رکھتا تو مَیں یہ مشورہ تمہیں کیوں دیتا؟"

پھر وہ اپنی نسوار کی ڈبیا کھول کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور سامان سفر کی درستی میں لگ گیا۔ مَیں دیر تک خیمے کے باہر لیٹی گہرے نفشئی آسمانوں کو تکتی رہی۔

کچھ دیر بعد جنگل کے راستہ پر ایک بوڑھا خانہ بدوش ایک نہایت ہی دردناک لَے کا پہاڑی گیت الاپتا ہُوا نمودار ہُوا۔ اس سے پہلے مَیں نے یہ گیت اُس وقت سُنا تھا، جب کپتان افراطی سفرِموت پر روانہ ہوئے تھے اور یا پھر آج سُنا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور مَیں مضطرب ہوکر بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

"ٹھیرو!" میں نے خانہ بدوش سے بے اختیار ہوکر کہا۔

بُوڑھا خانہ بدوش رُک گیا "آپ نے مجھے کچھ کہا؟"

"ہاں ـــــ" مَیں نے کہا۔ "تم یہ گیت کیوں گا رہے ہو؟"

خانہ بدوش بیٹھ گیا بولا۔ "ہم نے آپ کے سامنے پہلے بھی ایک دفعہ یہ گیت گایا تھا۔ اس گیت کا نام "موت" ہے۔ اور ہمیشہ اُیسے ہی موقعوں پر گایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کوئی بے وقوف ستلج باب الموت کی طرف روانہ ہونے لگے

یا پھر جب ہمیں کسی سیاح کی لاش نظر آجائے۔

مجھے دہشت سی محسوس ہوئی "تو پھر تم اس وقت کیوں گا رہے ہو؟"

وہ اطمینان سے کہنے لگا۔ "کیونکہ میں نے اپنے دوستوں سے سُنا تھا کہ تین دن پہلے انھوں نے کسی انسان کی لاش با بابوت کے ایک کنارے پر دیکھی ہے۔"

"لاش دیکھی ہے؟" میں مضطرب ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی "اُسی کی لاش تو نہیں تھی جو ہمارا ہمراہی تھا؟"

"کیا معلوم کتنی سیاح آتے ہیں۔"

"ڈاکٹر گار! ڈاکٹر گار!!" میں نے زور زور سے آوازیں دیں۔

ڈاکٹر دُھوپ کی ٹوپی پہنے ہوئے باہر نکل آیا اور اطلاع سُن کر بولا "ہمارے دورانِ قیام میں اور تو کوئی سیاح یہاں آیا نہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ وُہ کپتان افراطی ہی کی لاش ہوگی۔"

خانہ بدوش کہنے لگا "سُنتا ہوں بالکل سیاہ پڑ گئی تھی۔"

"سیاہ!" گار نے کہا۔

خانہ بدوش بولا "ہاں۔ یہ آسیبی سحر کا اثر ہے۔ میں نے اِن جنگلوں کے آسمان پر کچھ نہیں تو سات آٹھ سَو دفعہ چاند کو ڈوبتے اور اُبھرتے دیکھا

ہے بوڑھا ہو گیا ہوں مگر آج تک کسی سیاح کو اس سحر سے مقابلہ کرتے اور زندہ واپس آتے نہیں دیکھا۔ عام طور پر تو وہ اندر جا کر گم ہو جاتے ہیں۔ دس بارہ سال میں کبھی کسی سیاح کی لاش کا سراغ بھی لگتا ہے تو عجیب حالت میں اسنا ہے کہ لاش راتوں کی تاریکی میں جنگل کے کناروں پر چیختی کراہتی دیکھی گئی ہے۔ چہرہ سیاہ ہوتا ہے۔ آنکھیں ابھری ابھری، اور آواز بے حد بھیانک! اور وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہیں۔ مگر آج تک کسی سیاح کی لاش ہاتھ نہیں آئی۔ اگر ہاتھ آتی تو ان کو شہر کے ہاسپٹل میں لے جایا جاتا۔ اس کی بہت کوششیں ہو چکی ہیں مگر ہمیشہ آسیبی طاقت سامنے آتی رہی۔"

باوجود خانہ بدوشوں کے منع کرنے کے تمام دن ہم نے لاش کا سراغ لگانے کی جدوجہد میں کاٹ دیا۔ خانہ بدوشوں کو ہر طرف بھیجا۔ مگر بے سود۔ بقول خانہ بدوشوں کے یوں معلوم ہوتا ہے کہ کیمیا بوت کے آسیب زدہ جنگلوں کی لاشیں بھی سحر زدہ ہو جاتی ہیں اور پھر انسانی دنیا میں واپس آنا نہیں چاہتیں!

اس رات ڈاکٹر نے مجھ سے کہا، "روحی۔ اب یہاں رہنا فضول ہے! چلو فوراً ہی واپس چلیں۔"

۹ مئی سنہ ۴۰ء

پانچ دن ہوئے میں رودھناک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر گگارڈ فورغ کی بندرگاہ پر

مجھ سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہاں کئی اخبارات کے نمائندوں نے ہم سے ملاقات کی۔
گھر پہنچ کر اگرچہ خیالات میں کچھ سکون سا آ گیا ہے تاہم طبیعت بے چین سی ہے
تمام اخبارات میں کپتان افراطی کی پُراسرار موت پر عجیب عجیب افواہیں اور
خبریں شائع ہو گئی ہیں۔

آج نماز ظہر کے وقت میں باغیچے میں مالی سے چنبیلی کی بیل لگوا رہی تھی۔
کہ روناش نے ڈاک پیش کی۔ میں نے وہیں اک تنکوں والی گلستانی کرسی پر
بیٹھ کر اخبار کھول لیا۔ اُسے پڑھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اس میں یہ
اطلاع تھی کہ میرے چچا نواب الیاس نے "باب الموت" کی اک نئی مہم میں شرکت
کے لئے انجمن میں اپنا نام پیش کر دیا ہے۔ اک اور ورق اُلٹا تو رُوح لرز گئی
لکھا تھا:۔

"باب الموت کے آسیب زدہ جنگل!!
گیارہ آدمی موت کا شکار ہو گئے"

پھر اُن کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی تھی:۔

"مشہور شکاری کپتان افراطی کی گمشدگی سے متاثر ہو کر دس آدمیوں
کی جو ٹولی باب الموت میں داخل ہونے کا اعلان کرا چکی تھی) وہ ۲۰ مئی
کی شام شہر کیمیا بوت پہنچ گئی۔ دوسرے دن دس آدمیوں نے باب الموت

کی راہ لی۔ مگر جب تیسرے دن بارہ بجے تک کوئی واپس نہ آیا۔ تو سرجعفر کے سکرٹری مونس نے باب الموت پہنچ کر ان کا سراغ لگانے کی اجازت طلب کی۔ انہیں اجازت مل گئی۔ چنانچہ وہ بھی روانہ ہو گئے۔ مگر افسوس کہ یہ گیارہ کے گیارہ دلاور اب تک مفقود الخبر ہیں۔"

میں نے دہشت کے عالم میں اخبار گھاس پر پھینک دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

چچا الیاس کو یہ کیا سوجھی ؟ مفت میں اپنی جان کے دشمن کیوں ہوئے جا رہے ہیں ؟ اخبارات میں آئے دن کیپا لوت کے آسیب زدہ جنگلوں کا حال پڑھ رہے ہیں پھر بھی اُن کی یہ ہمت !! یہ سوچ کر مجھے شدید غصہ آیا۔ یہ بھی لوگوں کا اِک خبط ہے۔

میرا ارادہ چچا الیاس کے ہاں جانے کا ہو گیا ہے۔

۱۰ مئی ۱۹۴۰ء

شب گزشتہ میری نیند بے چین رہی۔ تمام رات گرم ہوا بانس کے سربلند درختوں پر المناک شور مچاتی رہی۔ اور کوئل پاس کے گلستان میں بیٹھی رہ رہ کر کوکتی اور چلاتی رہی۔ کس قدر عجیب رات تھی!

مجھے بار بار چچا الیاس کا خیال آتا رہا۔ تمام صبح میں نے اپنی خواب گاہ

میں بسر کی۔ زوناش نے صبح صبح تمام دریچوں پر موتیا اور چمبیلی کے پردے آویزاں کر رکھے تھے۔ چمن کی ہوائیں اُن سے ٹکرا کر اندر آ رہی اور کمرے میں ہوشربا نکہتوں کو وارفتہ کر رہی تھیں۔ تمام وقت میں اوڈی کولون سونگھتی رہی اور اس طرح میرے اعصاب میں اِک سکون سا آگیا۔

بارہ بجے کے قریب میں پوشاک بدل رہی تھی کہ نیچے کی منزل میں جا کر کھانا کھاؤں، اسی وقت ناگہاں دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں سمجھ گئی کہ مشرقی تہذیب کی شیدائی بوڑھی زوناش کے سوا کوئی نہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے ڈاک لا کر پیچے کے نیچے اِک تپائی پر رکھ دی۔ اور پھر المناک انداز میں حسبِ معمول اپنی اندھیری کلائیوں میں چاندی کی سفید سفید چوڑیاں ہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

آج کل میں اخبار کی بے حد مشتاق رہتی ہوں۔ اخبار کھول کر دیکھا تو اس میں چھ آدمیوں کی اِک اور ٹولی کی گم شدگی کی خبر درج تھی۔

آہ! —— یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں کیا؟ —— میرے دل نے سوال کیا۔ رب کے سب یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنی دیوانی کوششوں سے باز نہیں آتے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ کپتان افراطی کی گم شدگی کا حال معلوم ہوتے ہی نواب فریدوں اپنے پانچ ملازموں کے ساتھ

کیمیا بوت کے بنگلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ملازم باب الموت کے باہر ہی رہے اور نواب فریدول اندر روانہ ہو گئے۔ گھنٹہ بھر بعد وہ لڑکھڑاتے ہوئے بمشکل اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے باہر نکلے اور گر پڑے۔ ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ دانت زور سے بھنچے ہوئے تھے۔ ملازموں کو کھلی آنکھ سے تکتے تکتے اُن کی رُوح جسدِ خاکی سے پرواز کر گئی۔ وہ کیمیا بوت کے اسرار کے متعلق اِک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکے۔

اس خبر کو پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نواب فریدول میرے چچا الیاس کے جگری دوست ہیں۔ آہ وہ ان کی خشخشی داڑھی اور بھوری آنکھیں!! الٰہی! کیا میرے بدنصیب چچا بھی ان راہِ عدم کے مسافروں کا ساتھ دینے پر تُل گئے ہیں!

تین بجے میں نے نیبو کے ٹکڑوں کو بھگو کر اُن کے معطر پانی سے غُسل کیا۔ اور پھر کچھ دیر بالائے نفشئی شاعروں میں ٹہلتی رہی۔ اس سے اعصاب میں سکون سا آگیا، پھر اسبابِ سفر درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔ چچا کو ان کے خوفناک ارادے سے باز رکھنے کے لئے میں رات کی ٹرین سے شوراک روانہ ہونے کا قصد رکھتی ہوں۔

۱۱ رمئی ۱۹۴۰ء

آج صبح سویرے ہی میں چچا الیاس کے ہاں ڈوراک پہنچ گئی۔

جونہی میں نے زینے پر قدم رکھا، چچا الیاس کے ایک حبشی خانہ زاد نے مجھے کتب خانے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

میں اندر داخل ہوئی تو چچا کو میز کا بتی چراغ جلائے میز پر جھکا ہوا پایا۔ بادامی رنگ کے ڈریسنگ گون میں ملفوف منہ میں سگار دبائے بیٹھے تھے۔

مجھے اچانک اور خلاف توقع دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے: "بیٹی روحی!" ان کے منہ سے نکلا "تم! تم سے تو بہت ہوں باتیں پوچھنی تھیں۔ بلکہ میرا ارادہ تمہارے ہاں جانے کا ہو رہا تھا تاکہ کیمیا بوت کے سفر کے متعلق تم سے چند معلومات حاصل کروں۔"

"چچا! میں اسی لئے حاضر ہوئی ہوں۔" میں بے اختیار ہو کر بول پڑی "کہ آپ کو اس خوفناک ارادے سے باز رکھوں۔"

وہ سگار منہ میں دبائے ہوئے ہی بولے "کون سا ارادہ بیٹی؟ اس سفر کا؟ بابا الموت والا؟ — تو وہ تو طے ہو چکا۔"

"طے کیسے ہوا؟" میں نے ذرا چیں بجبیں ہو کر کہا "آپ نے مجھ سے رائے تک نہیں لی۔ یہ درست کہ آپ کے مقابلے میں میں شاید نادان ہوں مگر چچا! آخر آپ کی بھتیجی ہوں۔ اور —"

چچا الیاس مجھے اپنے بازو میں بٹھا کر بولے :" مگر میری پیاری امتو تم بزدلوں کی سی باتیں کرتی ہو !" (ذرا ہنس کر) " بہادر قوم کی لڑکی کے لئے یہ مناسب ہے کہ اپنے چچا کو فضول وہموں سے ڈرائے؟ تمہیں بتاؤ یہ بزدلی ہوئی یا نہیں؟"

میں بولی :" اس میں بزدلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ آپ کے بھی عجیب خیالات ہیں چچا جان گستاخی معاف ۔ اگر کسی شخص سے خواہ مخواہ کسی کنوئیں میں گرنے کے لئے کہا جاتے اور وہ اس سے انکار کرے تو اسے بزدلی تو نہیں کہا جا سکتا ؟ میں افراطی کی عبرتناک موت اپنی آنکھ سے دیکھ چکی ہوں چچا الیاس !"

چچا بولے :" تم نے ان کی موت تو نہیں دیکھی ۔ اندازہ لگا لیا کہ وہ ختم ہو گئے ۔ اسی لئے تو مجھے اشتیاق ہے کہ معلوم کتنے سیاح ان جنگلوں میں مقید ہیں ۔ کیسے معلوم زندہ ہی ہوں ! سوائے نواب فریدوں مرحوم کے آج تک کوئی سیاح کیبا بوت کے جنگلوں سے واپس نہیں لوٹا ۔ اور فریدوں کا لوٹنا بھی کیا لوٹنا تھا ! غریب کی زبان بند تھی اور وہ فوراً ہی ختم ہو گیا تھا !"

میں دہشت زدہ لہجے میں بولی :" یہی تو بات ہے ! میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں وہاں کے جنگلوں کی شیطانی تاثیر یا سحر کی معتقد ہوں ۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ بیسیوں سیاح موت کے گھاٹ محض اشتیاق میں اتر چکے ہیں ، اور کوئی واپس

نہیں لوٹا۔ ایسے مقام پر آپ کو جانے کی رائے بھلا میں کیونکر دے سکتی ہوں!
نواب فریدوں کی زبان سے وہاں کے اسرار کے متعلق ایک لفظ نکل سکا تھا۔۔۔
نہیں ـــــ آج تک کسی نے کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس کے باوجود آپ
اس سفر پر کمربستہ ہیں۔ آپ کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے ماہرین نفسیات کے
اس کلیے کو ماننا پڑتا ہے کہ قدرتی طور پر انسان آپ اپنا دشمن ہے!"
یہ کہہ کر میں بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور دریچے کے پاس چلی گئی۔
اسی وقت مشرقی شہ نشین کی طرف کا گہرے فیروزے رنگ کا بڑا سا
دروازہ کھلا اور شہزادی عائشہ کتب خانے میں داخل ہوئیں۔ (یہ ہماری ایک پرانی
بوڑھی رشتہ دار ہیں)
وہ مجھے خلاف توقع وہاں دیکھ کر حیران رہ گئیں: "ایں روحی! یہ کہاں سے
ٹپک پڑی! اچھی تو ہو بیٹی!"
چچا الیاس بولے "یہ ابھی آئیں۔ اس بات پر مصر ہیں کہ میں [illegible]
کے سفر کا خیال ترک کر دوں!"
شہزادی عائشہ حسب معمول ایک ابرو سکیڑ کر بولیں: "واہ! کیوں خیال
ترک کر دو؟ جب اتنا بہت انعام ملتا ہے۔ تو کیوں ایسی بات کا خیال جانے
دیا جائے؟"

مجھے شہزادی عائشہ کی حریص اور لالچی طبیعت سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔
میں نے کسی قدر بے ضبطی سے کہا: "انعام؟ —— یہاں انعام کی پروا کسے ہے؟ مجھے یقین ہے چچا کے ارادے کو انعام سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ محض ایک شوق کی بات ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ آپ انہیں منع کریں۔ آپ اُلٹی جانے کی رائے دے رہی ہیں۔"
بوڑھی شہزادی عائشہ اپنے لمبے لمبے ریشمی دامنوں کو سمیٹ کر دریچے کے نیچے ایک مخملی کوچ پر بیٹھ گئیں۔ اور بڑے فخر سے بولیں: "مجھے تو خود اس بات کا شوق ہے کہ اس مہم میں اپنا نام لکھواؤں۔ آخر میری عمر ہی کیا ہے؟ اسی بہار کا ذکر ہے کہ ایک جلسۂ رقص میں سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں ملکہ معظمہ اور اُن کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں سبھی شریک تھیں۔ سب کہہ رہے تھے کہ شہزادی تم تو اس سال تیس سال کی معلوم ہو رہی ہو!"
مجھے شہزادی عائشہ کی خبطی گفتگو سننے کی عادت تھی۔ مگر اس موقع پر ہنسی سی آگئی۔ اور میں نے کسی قدر نفرت سے اپنا سر دریچے کی طرف پھیر لیا اور انجان بن گئی۔
تھوڑی دیر بعد مراکشی لونڈیوں نے ناشتے کی چھوٹی چھوٹی تپائیاں

سامنے لگا دیں۔ حبشی خانہ زادوں نے چمن کی طرف کے تمام دریچے کھول دیئے اب آفتاب اچھی طرح طلوع ہو چکا تھا۔ اور اس شباب کی رنگین اور حسین صبح باہر باغیچے پر چھائی ہوئی تھی۔ دیودار اور صنوبر کے تناور درختوں پر ننھے پرندسیٹیاں بجا رہے تھے۔ چمبیلی کی خوشبو کتب خانے میں پھیلی ہوئی تھی۔ برقی روشنی بجھا دی گئی۔ اور ماہ مئی کے گستاخ آفتاب کی طلائی کرنیں شرنگ ایرانی قالین پاروں کے بیل بوٹوں کو زیادہ شوخ بنانے لگیں۔

جب چائے دانی بھی میز پر رکھ دی گئی۔ تو میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں نے صبح کی نماز نہیں پڑھی۔ قضا ہی پڑھ آؤں اگر آپ لوگ دس منٹ کی اجازت دیں"

چچا بولے۔ "بہت اچھا۔ تمہارا انتظار کیا جائے گا"

"مگر توس ٹھنڈے ہو جائیں گے" شہزادی عائشہ نے کہا۔

میں نے ان کی بات ان سنی کر دی اور باہر چلی گئی۔

جب میں نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ بالائی منزل کے زینے طے کر رہی تھی۔ تو اچانک میری مڈبھیڑ سر ہارلی سے ہو گئی۔ جو اس وقت گرمیوں کے ہلکے سے لباس میں یونان کے کسی حسین بت کی طرح محبوب نظر آ رہے تھے۔ وہ کتب خانے کی طرف چائے پینے کے لئے جا رہے تھے کہ انہیں

ناگہاں میں نظر آئی۔ انہوں نے تعجب کے عالم میں اپنی آنکھیں ملیں پھر بڑے جوش سے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "تم کہاں سے نکل آئیں؟ اس خوشگوار صبح میں۔ سفید زریں لباس میں تم بالکل چنبیلی کی ایک نو خیز کلی معلوم ہوتی ہو۔"

میں رقت بھری آواز کو سنبھال نہ سکی۔ بولی: "مجھے اس گھر میں سبھی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیوں روحی کیا ہوا؟"

"سبھی پاگل ہیں۔ مجھے تم سے بھی شکایت ہے۔"

"کس بات کی روحی؟ بتاؤ اور خدا کے لئے جلد بتاؤ۔"

"ہارلی! تم نے چچا کو کیبابوت کے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ ... تو پابرکاب معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر ہارلی ساکت کھڑے ہو گئے۔ زینے کے عین مقابل ایک چھوٹی سی عربی وضع کی دریچی کھلی ہوئی تھی۔ جس میں سے ایشیائی صبح کی گرم اور خوشگوار ہوا سرہارلی کی گہری قرمزی رنگ کی نکٹائی سے کھیل رہی تھی۔

سرہارلی ذرا اداس ہو کر بولے۔ "روحی مجھے خود افسوس ہے کہ میں نواب الیاس کو اس منحوس ارادے سے باز رکھنے میں ناکام رہا۔ سنتا ہوں

جب ایک دفعہ آدمی اس سفر پہ کمر بستہ ہو جاتا ہے۔تو وہ کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں کرتا۔مقناطیس کی طرح کھنچا چلا جاتا ہے۔مگر رُوحی — کیا تم واقعی مخالفت کر رہی ہو؟"

مَیں حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی"تو اور کیا یُونہی روک رہی ہوں ہم بھی کتنے عجیب ہو۔ہارلی! ہم لوگ تو محض اخباروں میں خبریں پڑھتے ہو۔مگر مَیں نے یہ المیہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!"

ذرا تامل کے بعد سر ہارلی بولے:"بیشک! اسی لئے تم اس شد و مد سے مخالفت کر رہی ہو۔مگر رُوحی۔بات یہ ہے جب نواب الیاس جیسے ضعیف العُمر شخص نے کمرِ ہمت باندھ لی تو مجھے شرمانا چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟"

"خیال آتا ہے۔کیوں نہ مَیں بھی اپنا نام اس فہرست میں شامل کرا لوں!"

"احمقوں کی سی باتیں نہ کرو!"مَیں نے زور سے جھڑکا۔"تم سمجھتے ہو یہ بہت بڑا کمال ہے۔چلو ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہوگا۔"

ہم دونوں چچا کے کتب خانے میں داخل ہوئے۔چچا الیاس تبدیل لباس سے فارغ ہو چکے تھے۔اور دریچے کے آگے کرسی پر بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ان کی پلاٹینم کی سفید انگشتری آفتاب کی پہلی زرد کرنوں

میں جگمگا رہی تھی۔ شہزادی عائشہ بے چینی کے انداز میں ناشتے کی تپائیوں کے آگے بیٹھی تھیں اور رہ رہ کر سموسے پر سموسے کھائے جا رہی تھیں۔

مجھے دیکھ کر کہنے لگیں "آؤ رُوحی! نان خطائیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی جلدی سے بیٹھ جاؤ۔ اور سرہارلی! تمہارے لئے قہوہ بناؤں یا چائے؟ بھیا الیاس تو تیز رنگ کی چائے کے شوقین ہیں۔ مگر میری توبہ ہے۔ ایک دن بھی بھولے سے اگر ذرا تیز رنگ کی چائے پی لوں تو چار دن اختلاجِ قلب میں مبتلا رہتی ہوں۔ بیٹی رُوحی! یہ نان خطائی لو۔ گرم گرم ہے۔"

حالانکہ مجھے بھوک نہ تھی۔ مگر میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ اگر نہ بیٹھتی تو شہزادی عائشہ کی ایک لمبی چوڑی اور بے معنی تقریر سننی پڑتی جس سے میں اکثر محفوظ رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔

سرہارلی ایک چھوٹی سی کرسی پر بیٹھ کر کافی پینے لگے۔

میں ایک نان خطائی اپنی پلیٹ میں رکھ کر اسے چپ چاپ تکتی رہی۔

چچا الیاس بے پروائی کے انداز میں کباب کا کنارہ منہ میں ڈالنے لگے۔ شہزادی عائشہ نہایت انہماک سے طشتری پر جھکی ہیں، اُسے چھوتیں اور پھر چکھتیں۔ ناشتے کی میز کیا تھی اُن کے لئے کوئی بہت ہی دلچسپ کتاب سامنے کھلی ہوئی تھی۔ ورنہ کون معقول آدمی ناشتے کو اتنی اہمیت دیتا ہے! میں دل

ہی دل میں ان سے نفرت کرنے لگی۔

یکایک شہزادی عائشہ نے میرے چہرے کی طرف دیکھا " روحی کھاؤ گی بھی؟ یا یونہی رکتا بیان تکتی رہو گی؟"

میں بولی " یونہی رکابیاں تکتی رہوں گی۔"

بدقسمتی سے میرے اس جملے کو شہزادی عائشہ نے مذاق پر محمول کیا، اور ہنس پڑیں۔ بولیں " بس اب رہنے دو۔ یہ لو۔ یہ ذرا سی تلی ہوئی کلیجی لو۔ اس پر انڈے کے قتلے رکھ کر کھاؤ۔ اس میں پنیر شامل کر دو، تو اور لذیذ ہوگا۔"

میں نے کہا " مجھے ایک چائے کی پیالی دیجیے تو عنایت۔"

چچا الیاس توس پر مربا رکھتے ہوئے سر ہارلی کی طرف متوجہ ہوئے " روحی میرے سفر سے ناخوش ہیں۔"

سر ہارلی ذرا مغموم لہجے میں بولے " سخت ناخوش اور متفکر! ابھی مجھ سے اس بات کی شکایت کر رہی تھیں کہ میں نے آپ کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کیوں نہ کی۔"

چچا بولے " بیٹی! میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مر گیا، تو دنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ مگر سر ہارلی نوجوان ہیں۔ انہیں اتنی جلدی مرنے

کی تیاری نہیں کرنی چاہئے۔"

میرا چہرہ یک لخت سفید پڑ گیا۔ اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے محسوس ہوئے۔ پیالی میں نے واپس طشتری میں رکھ دی۔ "یعنی ؟"

چچا بولے۔ "تم انہیں روکو۔"

یہ سُن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہارلی پر شدید غصّہ آیا۔ مُنہ سے صرف اتنا نکلا۔ "ہارلی !"

سر ہارلی چوروں کی طرح کھسیانے ہو رہے تھے۔ پاگلوں کی طرح ذرا سا ہنس کر بولے۔ "میرا مہم پر جانا بہت ناپسند ہے ؟"

میں غصّہ کے مارے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تمہارے دماغ میں فتور تو نہیں ؟ مجھ سے پُوچھا کیوں نہیں ؟"

ہارلی چُپ تھے۔ شہزادی عائشہ سیب کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں۔

"مجھ سے پُوچھا کیوں نہیں ہارلی ؟" میں نے برہم ہو کر دوبارہ سوال کیا۔

"کیا پُوچھتا ۔۔۔۔ ؟" وُہ دبی زبان سے بولے اور پھر ذرا شرما کر کہنے لگے۔ "نواب الیاس مذاق کر رہے ہیں رُوحی۔"

"کیوں چچا ؟"

چچا سفارش کرنے لگے۔ "مگر یہ اب بھی اپنا نام کٹوا سکتے ہیں۔"

سر ہارلی کہنے لگے۔ "بلکہ نوا تجھ روح کر کٹ حکا۔"

"میں کیوں سمجھوں! یہ تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ میں تو اصرار نہیں کرتی مگر تم عجیب آدمی ہو۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ کم از کم مجھ سے رائے تو لی ہوتی۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اتنی مخالفت کرو گی؟ ورنہ کبھی ایسی حماقت نہ کرتا۔"

میں بولی۔ "ہمیشہ جب کوئی کام کیا کرو، تو مجھ سے رائے لے لیا کرو۔ اس سے تمہاری خود اعتمادی کو ٹھیس نہیں لگ سکتی۔ میں ہمیشہ صرف رائے دیا کرتی ہوں۔ کبھی جبر تو نہیں کرتی۔"

شہزادی عائشہ ایک تلا ہوا آلو کاٹ کر کھانے لگاتے بولیں۔ "روپوں کی جھنکار کا لطف تم نہیں اٹھانا چاہتیں بیٹی زورحی؟ سب سے بہتر موسیقی یہی ہوتی ہے۔"

شہزادی عائشہ کی بات سن کر میری طبیعت اداس اور چڑچڑی سی ہو گئی۔ سرہارلی کہنے لگے۔ "چلو زورحی ساحل پر چہل قدمی کر آئیں۔ تم زرد ہو رہی ہو۔" اور ہم دونوں دروازے کی طرف جانے لگے۔

شہزادی عائشہ کی آواز آرہی تھی۔ "تم دونوں کہاں چلے؟ یہ سموسے تو کھاؤ۔ ان سموسوں کے پیٹ میں تو بادام کا حلوا بھرا ہے۔ اور ان سموسوں کے پیٹ میں قیمہ۔ تم لوگوں نے تو صرف چائے پی!"

۱۲ مئی سنہ ۴۰ء

کل رات روزنامچہ لکھنے کے بعد طبیعت دیر تک متوحش رہی۔ کچھ دیر سمندر کے کنارے چہل قدمی کرتی رہی۔ اس کے بعد باغ میں فوارے کے پاس شمشاد کے درخت کے نیچے ایک سنگِ مرمر کے چبوترے پر دریائی طوطوں کے پروں سے بھری ہوئی توشک بچھا کر لیٹی رہی۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند ڈوب رہا تھا۔ اور دُور گلاب کی روش میں سے چچا الیاس کے کتب خانے کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اندر کیمیا پوت کے جنگلوں کے سفر کے متعلق کوئی مضمون پڑھ رہے تھے۔

جب بارہ بجے اُنھوں نے سونے کی نیت سے کتب خانے کی روشنی گل کی تو میں بھی بادلِ ناخواستہ اپنی خوابگاہ میں جانے کے لئے اُٹھی۔ ابھی آفتاب گھڑی تک پہنچی تھی کہ یکایک چچا سامنے آ گئے۔ "میں خدا حافظ کہنے تمہاری خوابگاہ کی طرف گیا۔ کمرہ خالی نظر آیا تو واپس آ گیا۔ اندھیرے میں کیا کر رہی ہو بیٹی؟"

"ذرا اضطراب سکون کے لئے باہر نکل آئی تھی چچا!"

"میری بیٹی!" اُنہوں نے کہا۔ "تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ یقین کرو بچی! میں وہاں محض تجربے کے لئے جا رہا ہوں۔"

"[illegible] بھی تجربے کے لئے گئے تھے!"

چچا کہنے لگے۔ "میں ان بیوقوفوں کی طرح یہ تو نہیں کروں گا کہ بلا سوچے

سمجھے اندر گھس جاؤں ۔ میں تو پہلے کچھ دن اس مقام پر ٹھہر کر اس کے نشیب و فراز پر غور کروں گا، پھر باب الموت جانے یا نہ جانے پر غور کیا جائے گا۔"

چچا الیاس سے یہ سن کر میری جان میں جان آئی اور میں خوش ہو کر بولی۔ "یہ بات بے حد معقول ہے چچا جان۔ مگر ایک اور بات یہ ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"نہیں بیٹی۔ تم کیا کرو گی؟"

میں بضد ہو گئی "نہیں چچا! میں ضرور چلوں گی۔ ایک دفعہ آپ نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اب میری باری ہے۔"

چچا مسکرائے "بہت اچھا۔"

دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور جب رات کی ہوائیں زرد نیبو کے ..... پتوں میں خنودگی کے رنگ الا پنے لگیں، تو چچا نے میری پیشانی چومی اور شب بخیر کہا

۳ ارمئی ۱۹۴۸ء

صبح میں خوش تھی۔

صبح کا تمام وقت ہم نے اسباب سفر کی درستی میں کاٹا۔ میرا اسباب تو بندھا ہوا تھا ہی، اس لئے میں نے اپنے روزنامچے کے کچھ حصوں کی ترتیب دے دیئے۔

دوپہر کے بعد ڈاک دیکھی اور جواب لکھے۔ میں نے ڈاکٹر گار کو بھی خط

لکھا۔ اور اسے بندرگاہ فورغ پر آ ملنے کی ہدایت کی۔

غروب آفتاب کے وقت میں تھک گئی۔ اور خواب گاہ میں جا لیٹی۔ بوڑ
حبشن زوناش میرے سرہانے دریچے کے نیچے ایک زعفرانی قالین پار سے
بیٹھی ہوئی افیون کھاتی اور ہونٹ ہلا ہلا کر الف لیلہ کی اک کہانی پڑھ رہی تھی۔
کچھ دیر بعد زوناش نے میری طرف دیکھا ناک سکیڑ کر بولی "بس تھک
گئیں؟ اب کی دفعہ سفر پر جانے کو کسی حکیم نے کہا ہے؟ اعصاب کا یہ حال
پھر اس پہ یہ شوق سفر! معبود کی پناہ! ہمیں مہاذری کے خوفناک جنگلوں کی حد
کو کبھی چھوا سکتی ہوں لی بی بی؟ اور اب پھر یہ سفر درپیش ہے!"
میں نے کروٹ بدل کر اس کی طرف دیکھا "کیا بڑبڑا رہی ہو بڑھیا منہ
الف لیلہ کے قصے پڑھتی ہو پھر بھی سیاحی سے جی چراتی ہو؟ پاگل بڑھیا!"
زوناش کچھ افسردہ سی نظر آنے لگی۔ افیون کی ایک گولی نگلی۔ چہرہ کھبرکر بولی
"لو اب الیاس کا ارادہ کیبالوت کے بھوتوں کو قبضے میں کرنے کا ہے تو نہ
جانے دو۔ اب تمہیں اس مہم پر دوبارہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ بس بی بی تمہ
تو اک بہانہ چاہئے۔ کتنی بری بات ہے۔ معبود رحم کرے!"
میں ہنس پڑی۔ بولی "شیطان کی خوش دامن! گھر میں بیٹھ کر افیون
کی گولیاں ختم کرنے اور اونگھنے سے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم بھی حسب معمول میرے ساتھ چ

میرے جواب نے اسے بے حد برہم کر دیا۔ اگرچہ وہ ساتھ چلنے پر بالکل آمادہ ہے۔ مگر بظاہر مجھ سے رُوٹھی رہتی ہے۔ کبھی سیدھے مُنہ بات نہیں کرتی۔ اسے تو سوائے اس کے کہ ایرانی قالینوں پر بیٹھ کر عمر خیام کی رُباعیات گائے افیون کھائے، یا الف لیلہ پڑھے، دُنیا کے کسی مشغلے سے دلچسپی نہیں!

۷ ارمئی سنہ ۴۰ء

صبح شہزادی عائشہ، چچا الیاس، سرہارلی اور میں مع چند ملازمین کے کیمیا بوت پہنچ گئے۔ یہ سفر ہم نے کچھ تو اسٹیمر میں طے کیا، کچھ ٹرین میں، اور کچھ دیہاتی وضع کی تکلیف دہ گاڑیوں میں۔ ڈاکٹر گارکھی بندرگاہ فوغ پر ہم سے آملا۔ ہم نے اپنے خیمے بالکل اُسی جگہ پر نصب کئے ہیں جسے کپتان افراطی مرحوم نے اپنی مہم کے لئے منتخب کیا تھا۔

دن بھر کپتان افراطی کی موت کا خیال رہ رہ کر ستاتا رہا۔ میں اور ڈاکٹر گارز یادہ تر مرحوم ہی کی باتیں کرتے رہے۔

بوڑھی شہزادی عائشہ نے بھی محض انعام کے لالچ میں اپنا نام فہرست میں درج کروا دیا ہے۔ حالانکہ ان کا ڈھیروں روپیہ مختلف بینکوں میں پڑا سڑ رہا ہے۔ لیکن حریص طبیعت کو چین کہاں! سرہارلی نے اپنا نام فہرست سے کٹوا دیا۔ دوپہر کے بعد چچا الیاس کی طبیعت کچھ مکدّر سی ہو گئی۔ عام طور پر طبیعت کے

اس اتفاقی اضمحلال کو یہاں کے خانہ بدوش شیطانی تاثیر کہتے ہیں۔ وہ کھانے کے بعد اپنے خیمے میں جا کر لیٹ گئے۔ ڈاکٹر گار نے ان کا علاج شروع کیا۔ تکان اور اضمحلال طویل سفر کا سبب سمجھا گیا۔ مگر مجھے آج کپتان افراطی کے اضمحلال کا کئی بار خیال آیا۔

چچا الیاس تمام دوپہر بیٹھے لیٹے کیبا بورت کے آسیب زدہ جنگلوں پر کئی کتابیں پڑھتے رہے۔ تین دن کے لئے اُنہوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا ہے۔

۱۸ مئی ۴۰ء

آج صبح شہزادی عائشہ سیر سے واپس آئیں تو ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور وہ گلابی ہو رہی تھیں۔ کبھی آپ ہی آپ مسکرا پڑتیں۔ میں بڑی حیران ہوئی مگر پوچھا نہیں۔

سر ہارلی نے انہیں دیکھا تو مسکرا کر پوچھا: "کیا بات ہے شہزادی؟ آپ تو گلاب معلوم ہو رہی ہیں۔"

اس پر شہزادی عائشہ دلربایانہ طریق پر مسکرائیں۔ کہنے لگیں: "میں سیر کے لئے سامنے وادی تک گئی تھی۔ راستے میں ایک پہاڑی خانہ بدوش ملا۔ اس سے معلوم ہوا کہ باب الموت کے متعلق سحر اور جادو کے جتنے قصے مشہور کر رکھے ہیں وہ سب کے سب غلط ہیں۔ دراصل وہاں یاقوت کی کان ہے ––– یاقوت کی کان!! ار

یہی وجہ ہے کہ وہاں کے باشندے کسی اجنبی یا سیاح کو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ذبح کر ڈالتے ہیں۔

عجیب ہیں یہ شہزادی عائشہ! اس مقام پر موت جس صورت میں واقع ہوتی ہے۔ اس پر وہ ذرا دھیان نہیں دیتیں۔ انہیں تو افواہ پر یقین کرنے میں لُطف آتا ہے۔

دن بھر وہ یاقوت کی کان کے خیالی قصے سُنا سنا کر کان کھاتی رہیں۔ اُن کی خاص طبیعت کو حسبِ منشا موضوع ہاتھ آ گیا ہے۔

۱۹ رمئی ۱۹۴۰ء

آج ایک خوفناک حادثہ گزرا!

صبح اُٹھ کر دیکھا تو شہزادی عائشہ کے خیمے کا پردہ ہٹا ہُوا تھا اور وہ اپنے بستر پر سے غائب تھیں! پہلے تو خیال ہُوا کہ چہل قدمی کے لئے گئی ہوں گی، لیکن زونا شِ کہتی ہے کہ جب وہ نمازِ فجر کے لئے اُٹھی تو اُس وقت بھی شہزادی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے سمجھا کہ وہ تبدیلِ لباس میں مصروف ہوں گی، مگر جب کئی گھنٹے گزر گئے تو سب کے سب حواس باختہ ہو گئے۔ ہر ممکن جگہ انہیں تلاش کیا گیا۔ آفتاب جنگل پر پیتل کے تھال کی طرح جگمگانے لگا مگر ان کا سراغ نہ لگا۔

چچا الیاس سخت پریشان ہیں۔ آج اُن کے سفر کا دن تھا مگر پریشانی کی وجہ سے انہیں ملتوی کرنا پڑا۔

بدنصیب شہزادی نے شب گزشتہ مجھے کس جوش و خروش سے شب بخیر کہا تھا اور میرے یاقوت کے گلوبند کی دیر تک کتنی تعریف کرتی رہی تھیں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ اس طرح ناگہاں بچھڑنے والی ہیں تو میں ضرور انہیں اسی جوش سے خدا حافظ کہتی۔ پریشانی کے باعث نہ کسی نے ناشتہ کیا نہ آرام۔

۲۰ مئی ۱۹۴۰ء

رات جوں توں کر کے کاٹی۔

صبح بوڑھی حبشن زوناش نے سب کو انگشت پنیر کے ساتھ قہوہ کا ناشتہ دیا۔

چچا الیاس اپنی پھوپی زاد بہن کی اس اچانک گمشدگی پر بے حد ملول اور سراسیمہ ہیں۔ فطرۃً انہیں ہونا بھی چاہیئے۔ میں بھی جو شہزادی عائشہ کو مناسب فاصلے پر رکھنے کی عادی ہوں ان کی گمشدگی سے بے حد ہراساں ہو رہی ہوں، اور میرے اعصاب سخت متاثر ہیں۔

دوپہر کے بعد گرمی سخت پڑنے لگی، اور گرم ہواؤں کا شور کان کے پردے پھاڑے دیتا تھا۔ اس لئے ہم سب بڑے خیمے کے پردے گرا کر اندر بیٹھے قہوہ پی رہے تھے کہ زوناش اندر آئی اور گھبرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی "ایک خانہ بدوش نے کہا ہے کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ریشمی کپڑوں میں ملبوس باب الموت کی طرف سے آتی اور صحراؤں میں دیوانہ وار بھاگتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔ یہ بھی کہہ رہا تھا

کہ وہ بظاہر ادھر کی عورت معلوم نہیں ہوتی۔ تو ظاہر ہے تھا تو ن روحی رو شہزادی عائشہ ہوں گی۔

یہ سنتے ہی چچا الیاس اور سرہاری جبشی خانہ زادوں کے ساتھ فی الفور پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور ڈاکٹر گار میرے ساتھ رہ گیا۔

شام کے قریب چچا اور ہاری ناکام واپس آ گئے معلوم ہوتا ہے کہ بدنصیب شہزادی کو یاقوت کی کان کی بے پناہ کشش نے مقناطیس کی طرح کھینچ لیا۔ بعض لوگ زر و جواہر کے سامنے اپنی جان بھی ہیچ سمجھتے ہیں! انہیں میں کی ایک شہزادی عائشہ ہیں!

آج کا دن بھی بے حد پریشانی میں گزرا۔

۲۲ مئی ۱۹۴۰ء

آج چار دن بعد شہزادی عائشہ مل گئیں۔ لیکن کن حالوں میں؟ خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے!

آج ڈاکٹر گار نماز فجر کے بعد جنگل کی طرف گھومنے نکل گیا۔ اتفاق سے وہاں ایک طرف نظر اٹھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہزادی عائشہ بندریا کی طرح ایک درخت کی ٹہنی سے چمٹی ہوئی ہیں!

پہلے تو وہ سمجھا نہیں کہ یہ کیا شئے ہے۔ مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بدنصیب شہزادی ہے۔ اسی وقت ڈاکٹر گار بھاگا بھاگا کانپتا ہوا خیمے

میں آیا۔ اور ہمیں اس کی اطلاع دی۔

ہم سب کے سب جنگل میں نکل آئے۔ دیکھا تو بوڑھی شہزادی عائشہ درخت کی ایک اونچی ٹہنی پر بیٹھی دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔

قلب پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ سب نے انہیں بہتیرا سمجھایا اور نیچے اُترنے کے لیے کہا مگر وہ نیچے اُترنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئیں۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کے دماغ میں خلل واقع ہو چکا ہے۔ وہ ہمیں پہچانتی بھی نہ تھیں ورنہ ضرور اُتر آتیں، یا کم از کم بات ہی کرتیں۔

آخر سرہارڈی نے درخت پر چڑھ کر انہیں نیچے اُتارا۔ ایک چادر میں باندھ کر خیمے میں لے آئے۔ شہزادی عائشہ نے غصے میں ہارڈی کے ہاتھ پر دانت چبھو دیئے۔ وہ قطعی دیوانی ہو چکی ہیں۔

۲۴ مئی سنہ ۴۰ء

رات بمشکل کٹی اور آج بیچاری شہزادی عائشہ کو شہر کیمیابوت کے پاگل خانے میں داخل کرا دیا گیا۔

دربار کے نمایندوں کو اطلاع اور کہانی ختم ہو گئی۔ شہزادی عائشہ کے افسوسناک انجام نے ہم سب کو بے حد غمگین کر دیا ہے۔

میرا تو دل اکتا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے سرہارڈی سے کہا کہ چچا کو واپس

چلنے پر رضامند کرو، یا پھر میرے ساتھ واپس چلو۔

۲۴ مئی ۱۹۷۰ء

آج اخبارات میں "کیمیا بوت کے آسیب زدہ جنگلوں کے نئے انکشافات" کے عنوان سے شہزادی عائشہ کا المناک واقعہ شائع ہوا ہے جسے پڑھ کر چچا الیاس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک تار کے ذریعہ اخبار والوں نے شہزادی کی تصویر بھی ہم سے طلب کی تھی۔

صبح ناشتہ کے بعد چچا الیاس اور ڈاکٹر گار انہیں دیکھنے پاگل خانے گئے جو کچھ بہت [illegible] فاصلہ پر نہیں ہے۔ سر ہارلی میرے ساتھ خیموں میں رہے۔ میرا اپنا دماغ ٹھکانے نہیں، اس لئے میں نے دو اعصابی ٹکیاں زعفران میں گھول کر پئیں اور ڈی کولون میں رومال بھگو کر کنپٹیوں پر رکھا، اور ایک سفری چارپائی جنگل کی طرف رخ کر کے ڈلوائی اور اس پر لیٹی۔ سر ہارلی سے صبح کا اخبار پڑھوا کر سنتی اور باتیں کرتی رہی۔

دوپہر کے بعد جب چچا الیاس اور ڈاکٹر گار واپس آئے تو ان سے معلوم ہوا کہ شہزادی عائشہ کل کی نسبت آج کچھ بہتر معلوم ہوتی ہیں۔ چچا اور ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ پہچان گئیں۔ مگر ان کے کسی سوال کا صحیح جواب نہ دے سکیں۔ ڈاکٹر گار کا خیال ہے کہ ان کے دماغ پر عارضی اثر پڑا ہے۔ نفسیاتی طریقِ علاج سے اس بات

کی کامل توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ چند دنوں میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

شام کو غروب آفتاب کے وقت ہم نے ایک ہلکا سا ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران میں چچا الیاس کے سفر کا مسئلہ زیر غور رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ان کا وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا۔ کچھ دب سا گیا ہے۔

۲۵ مئی سنہ ء

آج کا دن نہایت گرم اور ویران رہا۔ ہواؤں میں سنہری ریت کے ذرے ملفوف تھے جو عموماً گرم مشرقی ممالک کے ساحلوں پر اڑتے پھرتے ہیں۔ یہ آنکھوں کے لئے سخت مضر ہوتے ہیں۔

نمازِ ظہر کے بعد سر ہارلی اور میں شہزادی عائشہ سے ملنے پاگل خانہ گئے تھے آج وہ بہت بہتر معلوم ہوتی تھیں۔ ان کا دماغ ٹھکانے پر آ چلا ہے۔ اگر ان کی ذہنی ترقی کی یہی رفتار رہی تو ہفتہ بھر یا اس سے کم مدت میں وہ تندرست ہو کر واپس آ سکیں گی!

۲۶ مئی سنہ ء

کل دن کو چچا الیاس کا ارادہ کچھ کمزور سا ہو رہا تھا مگر آج کھانے پر وہ سفر کے متعلق نہایت جوش و خروش سے باتیں کرتے رہے۔

ڈاکٹر گار نے کہا " بچاری شہزادی کے حادثے نے تمہارے ارادے کو کمزور

نہیں کیا نواب الیاس؟"

"کمزور!" چچا نے ہنس کر کہا "یوں کہو مضبوط کر دیا ہے ڈاکٹر۔ میں نے پرسوں صبح چلنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے ایک دفعہ عائشہ کو اور دیکھ آؤں۔"

چنانچہ دوپہر کے قریب ہم سب کے سب پاگل خانے روانہ ہو گئے۔ آج شہزادی کو دیکھ کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ اُن کی دماغی حالت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ ہوش میں آ چکی ہیں۔ صرف وحشت زدہ اور کھوئی ہوئی سی نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی خرابی نہیں۔ اب تو وہ ہمارے سوالوں کے جواب دیتی اور خود سوال کر لیتی ہیں۔

چچا الیاس نے کہا: "عائشہ! اب تو تم بفضل خدا تندرست ہو گئیں!"

"تو بھائی الیاس! میں بیمار کب تھی؟"

چچا بولے "مگر تم وحشت زدہ سی کیوں نظر آتی ہو؟"

شہزادی عائشہ ہنس کر بولیں "مجھے کیا معلوم! مجھے کیا ہو گیا تھا! بس چکر سے کبھی آ جاتے تھے اب تو میں اچھی ہوں۔ خدا کے لئے آپ لوگ مجھے یہاں سے لے چلیں۔ یہاں کے ماحول نے تو مجھے سچ مچ کا پاگل بنا رکھا ہے۔"

ڈاکٹر گار کہنے لگا "دو ایک دن میں واپس چلنے گا۔"

شہزادی عائشہ چڑھ گئیں۔ "ہرگز نہیں۔ اچھی بھلی ہوں۔ خواہ مخواہ مجھے پاگل مقرر کر رکھا ہے۔ یہاں میرے پاس نہ باس ہیں نہ میرے زیور! میرے الماس کے ہار کہاں ہیں؟ خوف کے مارے مجھے نیند نہیں آتی کہ کہیں میرے الماس چوری نہ کیے جائیں۔ میں یہاں پڑی ہوں۔ آخر یہ کس کی تجویز تھی؟ مجھے یہاں کیوں قید کیا گیا؟"

اس پر سرہارلی کہنے لگے۔ "شہزادی! تمہیں یاد نہیں؟ تمہیں خیموں کی زندگی سے نفرت ہو گئی تھی۔۔۔ تم وہاں سے ہم سب کو چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئی تھیں۔"

"ہاں سرہارلی!" شہزادی عائشہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "اب تو مجھے واقعات تمام کے تمام ہی یاد آتے جا رہے ہیں۔ تو یہ بھائی الیاس، انہنا اس ہیبت الموت والے سفر نے تو مجھے تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔"

یہ سُن کر چچا متوجہ ہو گئے۔ "تم پر کیا گزر رہی تھی عائشہ؟"

"کیا گزر رہی تھی۔۔۔" وہ چیخ کر بولیں۔ "نہ پوچھو کہ کیا گزری!"

چچا گھبرا گئے، بولے "خیر رہنے دو۔ کوئی جلدی نہیں۔ جب طبیعت سنبھل جائے تو بیان کرنا۔"

ڈاکٹر گار بولا۔ "شوق سے بیان کرنے دو نواب الیاس! نفسیاتی فرہنی طریق علاج یہی ہے کہ مریض کو بکنے دیا جائے۔ ہاں تو شہزادی! جو کچھ یاد آئے

یان کرتی جاؤ۔"

اور شہزادی عائشہ مسلسل کہتی رہیں " ہائے وہ انسانی ڈھانچے! کہیں کھوپڑیاں، کہیں دانت — کہیں گلا سڑا گوشت — مجھے نہ روکو، مجھے کہنے دو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انسانی پنجر دیکھے ہیں —"

وہ ہانپنے لگیں اور ہم وحشت زدہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ذرا سے وقفے کے بعد وہ چیخ چیخ کر بیان کرتی رہیں " میں نے اپنے معالج سے تمام باتیں بیان کر دی تھیں۔ اس سے مجھے تسکین سی ہو گئی تھی۔"

"وہ کیا باتیں تھیں شہزادی؟ ہمیں نہ سناؤ گی؟" ڈاکٹر گار نے سوال کیا۔

شہزادی کی زبان چل رہی تھی " وہ صبح آنکھوں میں ہے جس دن یہ واردات گزری۔ اس صبح جونہی میں اٹھی چہل قدمی کے لئے خیمے سے نکل پڑی۔ راستے میں مجھے خانہ بدوشوں کے غول کے غول نظر آئے۔ ان سے مجھے بابا الموت کے خزانے کا حال معلوم ہوا۔"

"خزانہ؟" ہم میں سے کسی نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں — خزانہ! میں خزانے کا حال سن کر آگے بڑھی، تو پہاڑ کے دوسرے سرے پر ایک خانہ بدوش بیٹھا گھاس کے بیج چبا رہا تھا۔ کوئی سو سال کا ہوگا۔ اس کی زبان سمجھ میں نہ آتی تھی۔ باوجود اس کے مجھے اس سے کافی معلومات

حاصل ہوئیں۔ اس نے جو کچھ کہا۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ باب الموت کے عین وسط میں یاقوت کی ایک بہت ہی بڑی کان ہے جس پر جنوں کا قبضہ ہے۔ میں شدتِ شوق میں چند خانہ بدوشوں کے ہمراہ اس سفر پر تیار ہو گئی۔ تم لوگوں کو خبر ہوتی تو مجھے روک دیتے۔ مزید برآں ــــ مزید برآں ــــ میرا یہ بھی خیال تھا، کہ یاقوت کی کان کا سوائے میرے کسی اور کو علم نہ ہو۔ چنانچہ میں چپ چپا تے نکل کھڑی ہوئی۔ سورج کے ڈھلنے سے پہلے ہم لوگ وہاں پہنچ گئے۔ خانہ بدوشوں نے کہا، کہ اب آپ قسمت آزمائی کر دیکھئے۔ اگر آپ کامیاب واپس آ گئیں تو نصف سے زیادہ حصہ ہمارا ہوگا۔ کیونکہ ہماری بدولت آپ نے چند گھنٹوں میں یہ سفر طے کر لیا۔ تم جانتے ہو بھائی الیاس، مجھے جواہرات کا جنون ہے۔ میں نے قدم بڑھانے اور باب الموت کی وادی میں زندگی کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ ہو گئی۔

" اللہ شوق دے تو ایسا دے!" سر ہارلی نے کہا۔

شہزادی مسلسل کہے جا رہی تھیں۔ " سب کو معلوم ہے کہ مجھے جواہرات کا جنون ہے۔ تم مذاق کرتے ہو سر ہارلی! ہم میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی قسم کا کوئی خبط ہوتا ہے۔ تم ہر وقت اپنی بندوق صاف کرتے رہتے ہو۔ روحی نیلے آسمان کو تکا کرتی ہیں۔ بھائی الیاس کتابوں میں غرق رہتے ہیں، مجھے جواہرات کا خبط ہے تو اس میں برائی کیا ہے آخر؟"

سرہارتی بولے "شہزادی تم بڑی بے انصاف ہو۔ تمہاری تعریف بھی کی جائے تو تم آگ بگولا ہو جاتی ہو۔ میں نے تمہارے شوقِ مبارک کی تعریف کی تھی یا اس پر نکتہ چینی؟"
شہزادی عائشہ بولیں "میں سمجھی تم نکتہ چینی کر رہے ہو۔ خیر! تم اگر باب الموت میں داخل ہوتے تو میری ہمت پر عش عش کر اٹھتے۔ تمہاری بندوق وہاں کام نہ آتی۔ وہاں ہر طرف ایسی خاموشی طاری تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ میں موت کی سرزمین پر پہنچ گئی ہوں۔ پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ میرا سانس گھٹنے لگا۔ وہاں کے آسیبی اثرات کے خیال سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کبھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چکر سے آ رہے ہیں۔ جانتی تھی کہ جادو نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ مگر تم جانو جواہرات کی محبت بری ہوتی ہے۔ خدا بخشے میری دادی مرحومہ کو بھی ہیروں سے عشق تھا۔ انھوں نے وصیت کی تھی کہ دفناتے ہوئے ان کے ہیرے کا گلوبند انھیں پہنا دیا جائے۔ ہائے۔ وہ گلوبند ان کے ساتھ ہی مٹی میں مل گیا ——— خیر میں نے جادو سحر کا خیال پاس نہ پھٹکنے دیا۔ اور پوری کوشش سے اپنے ڈوبتے دل کو سنبھال کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ اچانک مجھے سامنے زمین پر ایک گٹھڑی جیسی کوئی چیز نظر آئی۔ اس گٹھڑی کو دیکھ کر میں چلتے چلتے رک گئی۔ پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوئی اس کے قریب چلی گئی۔ دیکھا تو میرے معبود! وہ ایک انسانی لاش تھی۔ لاش بھائی الیاس کی! ہاں! معلوم ہوتا تھا جیسے باب الموت سے کوئی واپس جاتا جاتا گر پڑا اور جان بحق ہو گیا

اس ویرانے میں ایک لاش دیکھ کر خوف اور ہیبت سے میری جان نکل گئی۔ غالباً لاش کے تعفن سے بُو کا یہ عالم تھا کہ دماغ پھٹا جاتا تھا۔ میں دل کڑا کر کے اس کے قریب سے گزرنے کو تھی کہ مجھے لاش کی انگلی میں خون کبوتر کی طرح سرخ ایک اتنا بڑا یاقوت نظر پڑ گیا جس کی مثال کبھی میری نظر سے نہ گزری تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بدنصیب یہاں دوبارہ قسمت آزمائی کے لئے آیا تھا۔ پہلی دفعہ کامیاب گیا اور دوسری دفعہ لقمۂ اجل ہو گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ باوجود وحشت اور تعفن کے میں وہاں بیٹھ گئی اور لاش کی انگلی میں سے انگشتری نکالنے لگی۔ بے جان انگلیوں میں سے کوئی چیز جدا کرنا آسان نہیں۔ پھر ماحول کا یہ عالم کہ ہر طرف انسانی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں جدھر نگاہ اٹھتی تھی کسی کے جسم کا کوئی گلا سڑا حصہ نظر پڑتا تھا۔ میں دیوانہ وار جدوجہد کرنے لگی کہ جلد سے جلد فراغت حاصل کروں۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ ایک اَن دیکھے ہاتھ نے میرا گلا گھونٹنا شروع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر گار جو بے حد توجہ اور دلچسپی سے سرگزشت سن رہا اور اپنی نوٹ بک میں لکھ رہا تھا، کہنے لگا۔ "تم نے پہلے کہا تھا کہ تمہارا سانس گھٹنے لگا۔ پھر پسینے چھوٹے محسوس ہوئے۔ پھر دفعتہً یکلخت یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے گلا دبا دیا؟"

"ہاں ـــــــ"

"اور دوران سر بھی تھا؟"

شہزادی عائشہ بولیں: "بس یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا گلا دبا دیا۔ اور پھیپھڑے سانس لینے سے جواب دینے لگے۔ اور ایک ان دیکھے مضبوط ہاتھ نے میری سانس کی نالی کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک خرخراتی ہوئی چیخ میرے حلق سے نکلی اور میں نے لاش کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور فوراً واپس بھاگنے کی کوشش کی۔ نہ معلوم کہاں تک واپس بھاگتی چلی گئی۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں مجھ پر کیا گزرتی رہی!"

یہ بیان سن کر ہم پر ایک بوجھل سکوت طاری ہو گیا۔ لہو جیسے جسم میں جم کر رہ گیا۔ چہرے زرد پڑ گئے۔

ڈاکٹر گار نے خاموشی کو توڑا: "وہاں آپ کو کوئی زندہ جانور نظر آیا تھا؟"

شہزادی عائشہ کہنے لگیں: "وہ اصل معنوں میں باب الموت ہے ڈاکٹر گار۔ وہاں زندگی کے آثار ہی نہیں۔ میں نے کئی ایک گھوڑوں کے پنجر دیکھے۔"

ڈاکٹر گار کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی گئی۔ بولا: "آپ پر آسیبی اثرات کتنے فاصلے پر طاری ہونے لگے؟"

شہزادی کچھ سوچ کر بولیں: "بس دس بارہ منٹ بعد سر بھاری سا محسوس ہونے لگا۔ دم گھٹنے لگا۔ اور پھر آسیبی تاثیر نے کہیں کا نہ رکھا۔ زمین ہلتی ہوئی نظر آنے لگی۔"

ڈاکٹر گارشہزادی عائشہ سے سوال پر سوال کرتا رہا اور اُن کے جواب اپنی جیبی کتاب میں لکھتا رہا۔

شہزادی عائشہ کہنے لگیں۔ "بھائی الیاس! میرا کہا مانو۔ تم سفر کا ارادہ ملتوی کر دو۔"

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔ "ہرگز نہیں! شہزادی! میں آج تک تو نواب الیاس کو اس سفر سے روکتا رہا۔ مگر آج تمہارا بیان سُن کر اس سفر کے لئے خود تیار ہو گیا ہوں۔"

ہم سب حیران ہو کر اس کا مُنہ تکنے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بوڑھے ڈاکٹر کو فتورِ دماغ ہو گیا ہے۔

چچا الیاس حیران ہو کر بولے۔ "تمہارا کیا مطلب ہے ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر گار نے نسوار کی ڈبیہ نکالی اور مزے سے اُس پر چٹکی بجا کر بولا۔ "نواب الیاس! شہزادی کے بیان نے ایک عجیب راز مجھ پر افشا کیا ہے۔ اس آسیب پر غالب آنے کی چند تجویزیں میں نے سوچ لی ہیں۔ کامیابی کا کوئی راستہ نظر آ گیا تو بتاؤں گا۔ ورنہ اپنی ہنسی اُڑوانا مجھے منظور نہیں۔"

"آخر کچھ تو بتاؤ۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "میں چچا الیاس ہی کو روک رہی تھی اب آپ بھی تیار ہو گئے۔"

"بیٹی رُوحی یہ بات نہیں۔ میں تیار ہُوا ہوں تو کچھ سوچ کر ہُوا ہوں۔"

ہم سب بہت پوچھتے رہے۔ مگر ڈاکٹر گار نے کچھ نہ بتایا۔ غروبِ آفتاب کے وقت ہم لوگ اپنے خیموں میں واپس آ گئے۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس لئے ایک مفصل ناشتہ کی ہدایت کی گئی۔

میں چاء کی میز پر منتظر بیٹھی اِک کتاب پڑھ رہی تھی۔ چند ہی منٹوں میں سر ہارلی اور نواب الیاس تبدیل لباس کے بعد خیموں سے نکل کر ناشتے کی میز پر آ گئے۔

"کیا ڈاکٹر گار چاء نہیں پئیں گے بیٹی روحی؟" چچا الیاس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔

"ضرور پئیں گے۔" میں نے کہا۔ "مگر وہ ہیں کہاں؟"

سر ہارلی بولے۔ "اپنے خیمے میں گئے تھے۔ شہزادی کی باتوں نے انہیں غور کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ شاید کچھ بھلا نتیجہ نکلے۔"

اسی وقت ڈاکٹر گار اپنے خیمے سے باہر نکل آیا۔

چچا بولے۔ "میرا خیال تھا آپ تبدیل لباس میں مصروف ہوں گے۔"

ڈاکٹر گار کہنے لگا۔ "معاف کیجئے۔ میں نے لباس نہیں بدلا۔ یونہی ناشتہ کے لئے نکل آیا۔ میں ایک طبی کتاب پڑھ رہا تھا۔"

"طبی کتاب! اس وقت؟" ہارلی نے چاء کا گھونٹ لے کر کہا۔

"ہاں! ایک ضروری طبی کتاب!" ڈاکٹر گار نے کہا۔ پھر بولا۔ "تو نواب الیاس! آپ کا ارادہ پختہ ہے نا؟"

میں نے ذرا بیزار ہو کر کہا "مجھے تو یہ باتیں ذرا نہیں پسند۔ اب چائے پیجئے اور اس بحث کو جانے دیجئے۔"

چچا الیاس بولے۔ "ہاں ڈاکٹر۔ میرا ارادہ پختہ ہے۔ عائشہ آخر زندہ واپس آئی نہیں!"

ڈاکٹر بولا۔ "اور اپنے ساتھ معلومات کا اک دفتر لے آئیں۔ اگر مجھے ان کے یہ حالات معلوم نہ ہوتے تو میں کبھی آپ کی ہمراہی کا خیال نہ کرتا۔ ان کی باتوں کو سن کر مجھے خاص قسم کی تجویزیں سوجھی ہیں۔"

چچا ناشتہ کھا چکے تھے۔ اب سگار منہ میں رکھتے ہوئے بولے۔ "آج عائشہ کی باتیں سن کر مجھے خیال آیا ڈاکٹر۔ کیوں نہ میں تار دے کر اپنے چند شکاری کتوں کو منگوا لوں۔ پہلے ان پر تجربہ کیا جائے۔ وہ سدھے سدھائے کتے ہیں بیسیوں شیر اور چیتے ہلاک کر چکے ہیں۔"

ڈاکٹر گار جو ابھی تک خاموش بیٹھا ہوا تھا طشتری جلدی سے میز پر رکھ کر کہنے لگا۔ "نہایت معقول تجویز ہے نواب۔ آپ کو دُور کی سوجھی۔ بس آپ کل علی الصباح ریاست تار دے کر کوئی پچاس کتے منگوا لیجئے۔"

"مگر" میں بولی۔ "کتوں سے کیا ہوتا ہے چچا؟ ممکن ہے ان پر وہ آسیبی اثر ہوتا ہی نہ ہو جو انسان پر ہوتا ہے۔"

"جب اُن گھوڑوں پر ہوا جو سیاحوں کے ساتھ اندر گئے تھے تو کتوں پر کیوں نہ ہوگا؟" چچا نے کہا۔

"آہ! بیچارے کتے!" میں نے کہا "اب اُن کی بھینٹ چڑھے گی۔ اور یہ کہہ کر میں کرسی کو ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور کتاب کھول لی۔

۲۹ مئی سنہ ۴۰ء

آج دوپہر چچا الیاس کے حبشی ملازم پچاس شکاری کتوں سمیت کیبا بوت پہنچ گئے۔ ملازموں کا بیان ہے کہ کتوں نے سفر نہایت آسانی سے کاٹا اور فوجی سپاہیوں کی طرح باقاعدگی سے پیدل چلتے ہوئے کیبا بوت کا پہاڑی راستہ نہایت شوق سے طے کیا۔ اور ملازم خانگاڑی پر سوار ہو کر آئے۔

کتوں کے پہنچتے ہی اضطراب کی ایک لہر سب میں دوڑ گئی۔ چچا الیاس سفر کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر گار نے مشورے دینے شروع کر دیئے کہ ان کتوں پر کیونکر تجربے کئے جائیں۔ سر ہارلی ہاں میں ہاں ملانے لگے لیکن میں؟ — میں بھی ہُوئی اُداس تھی۔ جان جرکسوں کا کام نظار خوش کیسے ہوتی؟ مجھ سخت اکتائی ہوئی تھی۔

آج تمام دن ڈاکٹر گار اپنی طبی کتابیں کھول کھول کر دیکھتا اور بند کرتا رہا۔ بار بار کہتا۔ "افسوس! وہ کتاب ساتھ نہ آئی۔ وہ کتاب رہ گئی۔"

مَیں نے اُکتا کر کہا۔ "ڈاکٹر! کیا تم کیبابوت کے جنگلوں کے بھُوتوں کا علاج کرنا چاہتے ہو جو طبّی کتابوں میں دفن ہو گئے ہو؟"

وُہ کتاب پر نظر جما کر کہنے لگا۔ "ایسا علاج، جو آج تک کسی نے ان بھولوں کا نہ کیا ہوگا اور ہاں۔ آج تو شہزادی عائشہ کی واپسی کا دن ہے۔ ان سے مجھے کچھ اَور باتیں دریافت کرنی ہوں گی۔"

اور شام کے وقت شہزادی عائشہ واپس آ گئیں۔ آتے ہی وہ اپنے خیمے میں گئیں اور زیورات کا صندوقچہ نکال کر جھانکنے لگیں۔ ڈاکٹر گار ان کے خیمے میں چلا گیا اور ان میں کوئی گھنٹہ بھر باتیں ہوتی رہیں۔

رات کے وقت چچا نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈاکٹر گار! مجھ سے زیادہ مستعد تو تم ہو رہے ہو!"

ڈاکٹر گار بولا۔ "نواب! مجھے اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجیے۔ اب ان بھُوتوں کا خاتمہ سمجھئے۔"

چچا کہنے لگے۔ "نیکی اور پُوچھ پُوچھ؟ ضرور چلئے اور شوق سے چلئے۔"

شہزادی عائشہ بولیں۔ "خدا کرے آپ دونوں صحیح سلامت آ جائیں اور یاقوت کے دہکتے ہوئے شعلہ زا ٹکڑوں سے آپ لوگوں کا دامن بھرا ہُوا ہو۔"

۳۰ مئی سنہ ۴۰ء

آج صبح کی چائے کے بعد ڈاکٹر گار کہنے لگا: "رُوحی! مَیں ایک ضروری کام کو شہر جا رہا ہوں۔ رات تک واپس آ جاؤں گا۔ میرا انتظار کھانے پر نہ کرنا۔"

یہ کہہ کر وُہ چلا گیا۔

تمام دِن چچا الیاس اپنے کُتوں کی تعلیم میں منہمک رہے۔ بار بار سیٹی بجاتے اور کُتے سیٹی کی آواز کے ساتھ حکم بجا لاتے۔ دِن بھر کی سیٹیوں نے میرے تو اعصاب بگاڑ ڈالے۔

ڈاکٹر گار رات کی بجائے غروبِ آفتاب کے وقت واپس آ گیا اور آتے ہی نہانے کے لئے ایک اُبلتے ہوئے چشمے پر پہاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

مَیں اور سر ہارلی ٹہلتے ٹہلتے ڈاکٹر کے خیمے کی طرف گئے تاکہ دِن بھر غائب رہنے کے بعد جو چیزیں وہ ساتھ لایا تھا اُن کا کھوج لگائیں۔

اندر پہنچ کر اچانک میری نظر ایک عجیب و غریب شے پر پڑی جو ڈاکٹر گار کی چارپائی پر دھری تھی۔

"ہارلی! یہ کیا ہے؟" مَیں نے متعجب ہو کر کہا۔

سر ہارلی جُھک کر غور سے دیکھنے لگے، پھر اُٹھا کر بولے: "ارے یہ تو غوطہ خور کا لباس ہے رُوحی۔ اس کو پہن کر غوّاص سمندر کی تہ میں جاتے اور موتی نکال

لاتے ہیں۔ یہ جو تمہاری گردن میں سرانڈیپ کے موتی ہیں اسی ترکیب سے نکلے ہوئے ہیں۔ مگر یہ یہاں آیا کیسے؟"

میں نے اسے چھوکر اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے میں نے کبھی کسی فلم میں دیکھا تھا۔ اصل دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ بولی "اس میں یہ رسی کیسی لگی ہے ہارلی! یہ تو بے انتہا لمبی ہے جیسے شیطان کی آنت!"

سرہارلی بولے "رسی نہیں۔ یہ نالی ہے۔ اس نالی کا ایک سرا سمندر کی سطح سے اوپر رہتا ہے، دوسرا غوطہ خوروں کے لباس کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے۔ اور غوطہ خور کے ساتھ سمندر کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی نالی کے ذریعے تو غوطہ خور سانس لیتے ہیں۔ ورنہ دم گھٹ کر مر نہ جائیں؟"

"عجیب چیز ہے!"

اسی وقت خیمے کا پردہ اٹھا اور ڈاکٹر گانسل کے لباس میں اندر آ گیا۔ مسکرا کر شگفتگی سے بولا۔ "ایں ایں! تم لوگ میری راز کی چیزیں دیکھ رہے ہو۔ شریرو! باہر جاؤ!!"

"معاف کرنا ڈاکٹر" میں نے کہا "مجھے یہ چیز عجیب سی لگی تو میں ہارلی سے پوچھ رہی تھی کہ یہ کیا ہے؟"

سرہارلی ہنس کر بولے "کیا اب موتی کی تجارت کا ارادہ ہے بوڑھے گار شہزاد

عائشہ کی رائے ہو گی؟"

ڈاکٹر گار اس وقت بے حد شگفتہ نظر آ رہا تھا اس لئے مسکرایا۔ نسوار کی ڈبیا تپائی پر سے اُٹھاتے ہوئے بولا "ہاں! اب کہ موتی کی تجارت سے زیادہ قیمتی کام کروں گا۔"

"تو آپ اسی چیز کی تلاش میں صبح صبح نکل پڑے تھے؟" میں نے پوچھا "آخر اس کا کرو گے کیا؟ کل سے تم کچھ عجیب سے نظر آ رہے ہو؟"

ڈاکٹر بولا "مجھے پتہ تھا کہ یہ لباس یہاں نہیں ہے گا۔ وہ تو اتفاق ہی سے مل گیا بیٹی!"

میں بولی "مگر وہ گئے کہاں؟ سال گذشتہ ہارٹی نے سراندیپ کے موتی کا ایک ہار مجھے تحفہ دیا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ سیپ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ موتی کس طرح نکالتے ہیں؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

ڈاکٹر گار ہنس کر بولا "بیٹی تم صرف ہارٹی کا دیا ہوا ہار پہننے پر اکتفا کرو۔ یہ ہار کیونکر تیار ہوا اس کا تردد نہ کرو۔ چائے تیار کراؤ۔ تھکا ہوا ہوں۔ دیکھو کوئی لذیذ ناشتہ بھی کھلاؤ۔ کیا معلوم تم لوگوں کے ساتھ چائے پینا پھر نصیب بھی ہوتی ہے کہ نہیں۔ کل ہمارے سفر کا دن ہے۔"

سر ہارٹی بولے "پیارے ڈاکٹر گار! اگر تم نے بھی دوسرے مسافروں کا ساتھ

دیا اور ہم سے مُنہ موڑ لیا تو مجھے دلی صدمہ ہوگا۔ بچپن کے بزرگ رفیق کو کھو دینے کے بعد بخدا زندگی بالکل ویران ہو جائے گی۔ کیوں رُوحی ؟"

مَیں بولی :" تم بھی عجیب آدمی ہو بارلی ! بھلا یہ فالیاں کیوں کرتے ہو ؟ چلو ڈاکٹر! ناشتہ کریں۔ نہ جانے تم لوگوں کو کیبیا بوت کے اسرار کی دُھن کیوں لگی ہوئی ہے۔ مجھے تو یہ بات احمقوں کی سی معلوم ہوتی ہے۔ نامبارک تھی وُہ گھڑی جب تم نے جہاز پر میرا تعارف کپتان افراطی مرحوم سے کروایا تھا، نہ وہ ملتے، نہ یہ مصیبتیں ٹوٹتیں۔ اس کی ذمہ دار مَیں بھی ہوں۔ اسی لئے مجھ میں احساسِ جرم ہے۔ پہلے چچا الیاس تُلے ہوئے تھے کہ اپنی زندگی کی بھینٹ چڑھائیں گے اب تمہیں یہ سودا سمایا ہے! شکر ہے بارلی نے توبہ کر لی ۔"

ڈاکٹر گاربولا :" میرا خیال ہے کہ مَیں زندہ واپس آ جاؤں گا۔"

"اور پھر پاگل خانے جاؤں گا شہزادی کی طرح ۔" سر بارلی نے جُملہ ختم کیا۔ اور ہنسنے لگے۔

ہم سب باہر نکل آئے ، جہاں چائے تیار تھی اور چچا الیاس بے چینی سے ڈاکٹر کے منتظر تھے ۔

ڈاکٹر کو دیکھتے ہی چچا بولے :" آج دن بھر میں کُتوں کی تعلیم میں مصروف رہا۔ مَیں بولی :" ہاں سارا جنگل چچا کی سیٹیوں سے گونجتا رہا ۔"

چچا بولے "سیٹی کے بجتے ہی کُتّے تیار ہو جاتے ہیں۔ بس اشارہ کافی ہوتا ہے۔ آپ صبح سے کہاں غائب رہے ڈاکٹر؟"

"کل کے سفر کی تیاریوں میں مصروف تھا نواب۔ آخری شام ہے۔ آیئے کچھ ہنس بول لیں۔ نہ جانے یہ زندگی وفا بھی کرے یا نہ کرے۔ اور اگر سچ مچ کا کوئی آسیب ہمارا گلا گھونٹنے لگے، تو بس یہ شعر پڑھتا ہوا جنّت کی طرف پرواز کر جاؤں گا ؎

دُنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے
چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

سر ہارلی زور سے ہنس پڑے "چرچے یہ ہرگز نہیں رہیں گے ڈاکٹر! بغیر تمہارے ہماری دُنیا میں کوئی مزہ نہیں! مگر یہ تو کہو تم سیدھے جنّت ہی کی طرف پرواز کرو گے نا!"

ڈاکٹر گار اور چچا الیاس ہنس پڑے۔

میں بولی "ہارلی! ایسے سنگدل ہو! ایسے موقعہ پر ایسا مذاق! تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"

ڈاکٹر گار بولا "بیٹی ہارلی کو ڈانٹتی کیوں ہو؟ آخری شام ہنسی مذاق میں بسر ہونی چاہیے"

"میں باز آئی ایسے مذاق سے!" میں نے کہا "مجھے تو رونا آ رہا ہے۔

ہوش و حواس قائم نہیں تھے۔

اُس رات ہم لوگ دیر تک پہاڑ کے رخ کرسیاں ڈال کر چاندنی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شہزادی عائشہ اپنے خیمے میں لیٹی رہیں۔ جنگل کی ہوائیں تہا دینے والی تھیں اور ماہ مئی کا بوڑھا چاند جنگل کے ویران آسمان پر یوں چمک رہا تھا جیسے تجویزیں سوچ رہا ہو!

۳۱ مئی سنہ ۴۰ء

آج چچا الیاس اور ڈاکٹر گار باب الموت روانہ ہو گئے۔ میرے معبود! ان کی روانگی کا وقت! مجھے مدت تک نہ بھولے گا۔ روتے روتے میری تو ہچکی بندھ گئی تھی۔ سہارنی بھی حواس باختہ تھے۔ چچا الیاس بالکل چپ چاپ تھے مگر ڈاکٹر گار کے چہرے پر کسی قسم کا تردد نہ تھا۔

بچپن سے ڈاکٹر گار کی باتیں سننے اور اس کے ساتھ رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اب اُسے ہمیشہ کے لئے رخصت کرنے کے خیال سے رُوح لرز رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے چچا سے زیادہ ڈاکٹر گار کی جدائی شاق گزر رہی تھی۔ دِل بار بار سوال کرتا تھا۔ ڈاکٹر گار کی پُرانی اور مہربان صُورت پھر نظر بھی آئے گی یا نہیں؟ وُہ اس کی غیر شاعرانہ بھدی آواز۔ وہ نسوار کی ڈبیا! اور رہ رہ کر ناک کو رگڑنا! وہ ہم سب کا بچپن کا سرپرست اور رفیق تھا، اور ساتھ ہی

اس سے وہ بے تکلفی تھی جو ہم عمروں سے ہوتی ہے۔ وہ تکلف نہ تھا جو بزرگوں سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم سب کو بوڑھے ڈاکٹر سے بے انتہا محبت تھی۔ ان لوگوں کی رخصت کے وقت خانہ بدوشوں نے وہی گیت زور زور سے گانا شروع کر دیا جو اس سے پہلے کئی منحوس موقعوں پر گا چکے تھے۔ ہم نے انہیں بخیر روکا کہ وہ نہ مانے اور گاتے ہوئے مسافروں کے ساتھ دور تک گئے۔ آخر اُن کے گیت کی آواز مدھم پڑنے لگی۔ مدھم ۔۔۔ بہت مدھم!! اور پھر غائب ہو گئی اور اس کے بعد میں اپنے خیمے میں جا کر لیٹ رہی۔ اعصاب سخت متاثر تھے، اس لئے رہ رہ کر میں نے اوڈی کولون سے بال دھوئے اور دوا کھائی۔ شہزادی عائشہ جب سے آئی تھیں اپنے خیمے میں لیٹی رہتی تھیں، اس لئے دسترخوان پر صرف میں اور ہارلی رہ گئے۔

رات کے کھانے کے بعد میں اور سر ہارلی نشست کے خیمے میں الم زدہ بیٹھے جانے والوں کی واپسی کی تمنا کرتے رہے۔

۴ جون ۱۹۴۰ء

آج کا دن ہمارے لئے ایک یادگار دن ہے۔ کیونکہ آج مسافروں کی واپسی کا دن تھا۔ اس دن کی ابتدا یوں ہوئی:۔

جونہی صبح نیند سے میں بیدار ہوئی ہارلی کے خیمے کی طرف گئی اور انہیں

باہر ہی سے آواز دینے لگی "ہارلی ہارلی! خدا کے لئے اُٹھو! آج واپسی کا دن ہے! تم سوئے پڑے ہو! خدا کے لئے اُٹھو۔ یا تو آج چچا اور ڈاکٹر واپس آئیں گے یا پھر ہم انہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گے"

بارے سرہارلی نیند سے اُٹھے اور خیمے کے دروازے پر آ کر بولے:-

"سلام شوق رُوحی! مَیں ابھی غسل کر کے آیا۔ اس کے بعد انتظار شروع کیا جائے گا"

تھوڑی دیر میں سرہارلی نیلیتری کے رنگ کی ایک خوش رنگ نکٹائی لگائے باہر نکل آئے۔ ہم دونوں نے چائے پی۔ شہزادی عائشہ کی چائے ملازموں نے خیمہ ہی میں پہنچا دی۔

چائے کے بعد ہم خیمے کے باہر ہاتھ میں دُوربین لئے بیٹھ گئے۔ دِل دھڑک رہا تھا۔ حواس معطل تھے۔ رہ رہ کر آہ دھوئیں کی طرح دِل سے اُٹھتی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ مَیں ہمیشہ کی قنوطی ہوں۔ اس لئے اُن کی آمد کی خوشی سے زیادہ، اُن کی موت کا ماتم کر رہی تھی۔ قنوطیت انسان کو کس قدر ہراساں بنا دیتی ہے!

آٹھ سے نو اور نو سے دس بج گئے۔ ہماری آنکھیں انتظار اور شوقِ دید میں جنگل کے پہاڑی راستوں پر لگی ہوئی تھیں۔ پر آنے والوں کا سُراغ نہ تھا!

شہزادی عائشہ بھی بیتاب ہو کر خیمے کے دروازے تک آئیں اور پوچھنے لگیں "سرہارلی! کیا بجا ہو گا؟ یہ لوگ آئیں گے بھی یا وہیں کے ہو رہیں گے؟"

شہزادی عائشہ کی رائے تھی کہ خانہ بدوشوں کو بھیجا جائے مگر خانہ بدوشوں نے ہماری بات کی پروا نہ کی۔

آخر ایک بج گیا۔ جنگل آفتاب کی گرم اور سنہری کرنوں سے جگمگا اٹھا۔ صبح کے پرندوں نے اپنی سیٹیاں بند کر دیں مگر مسافروں، بدنصیب مسافروں کا سراغ نہ لگا!

میں اپنے خیمہ میں واپس آئی اور دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ کر ابلتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے لگی۔

سرہارلی اندر آئے اور افسردگی کے لہجہ میں بولے "روحی پیاری! ہراساں ہونے سے حاصل؟ ابھی تو غروب آفتاب تک انتظار کیا جا سکتا ہے۔ ویسے ہی تمہارے اعصاب متاثر ہیں، کچھ دیر سو رہو۔"

میں لیٹ گئی۔ آنسو تھمتے نہ تھے۔ سرہارلی ایک ڈک چیئر پر دروازے کے قریب کوئی کتاب لے کر بیٹھ گئے۔ مگر رہ رہ کر اُن کی نظر دروازے کے باہر جنگل کے راستہ پر جاتی تھی۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جنگل تپا ہوا تھا، اور ہواؤں میں المناک شور سنائی دے رہا تھا۔ چچا اور ڈاکٹر کے چہرے میری نظروں کے آگے تھے۔ میرا خیال تھا میں پاگل ہو جاؤں گی۔ سرہارلی نے کرسی میرے قریب کھینچ لی اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ مگر میرا دل سخت متوحش اور بے حد اُداس تھا۔ دو گھنٹے یونہی گزر گئے۔ ہارلی تسلیاں دے رہے تھے مگر

مجھ قنوطی پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

یا ہر ناگہاں چند خانہ بدوشوں کا شور سنائی دیا۔ ہمارے حواس معطل ہو گئے۔ دوڑ کر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ خانہ بدوش آپس میں باتیں کر رہے اور شور مچا رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ہماری طرف دوڑ کر آئے اور ہم دونوں کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ اُن کی بات زیادہ سمجھ میں نہ آتی تھی سا دھر سے شہزادی عائشہ بھاگی بھاگی آئیں۔ خانہ بدوشوں کے چہروں پہ مسرت کے آثار تھے۔ مگر اُن کی خوشی اطمینان بخش نہ تھی۔ ان کے جذبات ہم سے بہت مختلف تھے۔ وہ غم کی باتوں پر ہنستے اور ہنسی کی باتوں پر ماتم کرتے رہتے تھے۔

آخر بڑی مشکل سے ایک خانہ بدوش نے ہمیں سمجھایا کہ چند مسافر واپس آ رہے ہیں۔ یہ سُن کر ہم تینوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کس حال میں؟ یہ سوال ہم کو مضطرب کیئے دیتا تھا۔

اتنے میں خانہ بدوشوں کا ایک اور غول پہاڑی سے شور مچاتا ہوا نیچے اُترا، وہ ناچ رہے تھے اور ہم سے مخاطب تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ چچا اور ڈاکٹر صحیح سلامت واپس آ رہے ہیں۔ ہم تینوں خیمے سے باہر نکل آئے اور دوربین لگا لگا کر پہاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ آدھے گھنٹے کے بعد پہاڑی پر ایک ہجوم اُبھر آیا۔

"لو ہارلی" میرے مُنہ سے نکلا۔ "یقیناً وہ لوگ واپس آ رہے ہیں!"

ہم تینوں اضطراب کے عالم میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دوربینوں کی مدد سے

ادھر تکنے لگے کہ آنے والوں میں چچا الیاس اور ڈاکٹر گار بھی ہیں یا نہیں — مگر دُور سے تو صرف خانہ بدوشوں ہی کا غول نظر آرہا تھا۔ نہ چچا کا سُراغ تھا نہ ڈاکٹر گار کا۔ ہمارے دل دھک سے رہ گئے!
سر ہارلی اضطرار و سراسیمگی کی حالت میں کبھی اس ہجوم کی طرف جانا چاہتے، کبھی میری تنہائی کا خیال کر کے رُک جاتے۔ تمام ملازمین خیموں سے باہر نکل آئے تھے اور ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے!
خدا خدا کر کے پہاڑی خانہ بدوشوں کا جلوس قریب آیا۔ ناگہاں میری اور ہارلی کی نگاہ ایک ساتھ چچا الیاس پر پڑی۔ میں نے کہا: "ہارلی! وُہ رہے چچا! خدایا تیرا شکر ہے۔ مگر صرف چچا ہی چچا ہیں؟"
سر ہارلی نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر کہا۔ "وہ رہا — وہ — دُور پر ڈاکٹر گار!"
اور ہماری آنکھیں فرطِ مسرّت سے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں! ان دونوں کو پھر اپنے خیمے کے دروازے پر زندہ و سلامت کھڑا پانا! الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔
جب وہ لوگ قریب آئے تو کسی کے مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ میں تو باری باری سے دونوں سے چمٹی۔ دونوں کے چہرے دفورِ مسرّت و کامرانی سے جگمگا رہے تھے۔ تو کیا اُنہوں نے مہم سر کر لی ہے؛ یقین نہیں آتا تھا۔
سر ہارلی نے اضطرابی کیفیت میں کہا۔ "خدا کے لئے کچھ کہئے کہ کیا ہوا؛ اشتیاق نے پاگل بنا رکھا ہے۔"
"چچا الیاس غرور کے مارے تنے ہوئے تھے اور ڈاکٹر گار کا دماغ تو آسمان پر معلوم ہوتا تھا۔

آخر چچا جان فرمانے لگے "بیٹی رُوحی اور سہارلی پہلے تو تم دونوں دل کھول کر ڈاکٹر گارکو سبارکباد دو۔ انہوں نے وہ کام کیا جو کسی سے نہ ہوسکا!"

"تو کیا مہم سر کر لی؟" ہم دونوں نے ایک ساتھ پُوچھا۔

"وُہ راز" چچا کہنے لگے "وُہ اسرار جس نے سالہا سال سے نصف مشرق کو سرگردان وحیران کر رکھا تھا ــــ وہ آخر ڈاکٹر گار کے طفیل کھلا!"

"کیا واقعی چچا؟ ــــ"

اور ہم لوگ وارفتگی کے انداز میں اندر خیموں میں آگئے۔ باہر خانہ بدوش خوش دِلی اور بشاشت کے اظہار میں شور مچا رہے تھے۔ اندر جا کر ہم لوگ بیٹھ گئے تو مَیں نے پُوچھا "اب خدا کے لئے مفصّل بیان کیجیے۔ اب ہم سے صبر نہ ہوسکے گا۔ یہ بتایئے کُتّے کہاں ہیں؟ سب کے سب مر گئے؟"

ڈاکٹر گار کو مسرّت کی ہچکیاں آرہی تھیں وُہ کہنے لگا "ہم دونوں کے عوض چند کتوں کی بھینٹ چڑھی۔ باقی کتنے زندہ واپس آگئے ہیں۔ اصل کامیابی کا سہرا سچ پوچھیے تو شہزادی عائشہ کے سر رہا۔ نہ وہ جاتیں نہ مجھے وہ اہم باتیں معلوم ہوتیں۔ اِن کے بیان کو سُن کر یکلخت مجھے خیال آیا تھا کہ آسیب زدہ جنگلوں کا اصل راز کیا ہوسکتا ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ باب الموت کے اندر خوفناک دلدل ملتے ہیں جن میں پاؤں دھنس جاتے ہیں۔ نیز اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ چکّر محسوس ہوتے ہیں۔ سر بھاری معلوم ہوتا ہے، اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ بس

یہی باتیں اس راز کے معلوم کرنے کا ذریعہ بن گئیں۔ تمہیں یاد ہوگا، یہ باتیں سُن کر میں کچھ سوچنے لگا تھا۔ مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا کہ کیپابوت کے جنگلوں کا آسیب کون ہے۔ چنانچہ میں نے اسی دن شہر جا کر غواصوں کا لباس خریدا۔ اور در اصل اسی کی مدد سے کامیابی حاصل کی۔ میں نے وہ لباس خود پہن لیا۔ اپنے ساتھ دس کتوں کو لیا اور خدا کا نام لیتا ہوا ان آسیب زدہ جنگلوں میں داخل ہو گیا ——— نہ پوچھو دل کی کیا کیفیت تھی۔ کبھی فتح مندی و کامرانی کا خیال، کبھی ناکامی اور موت کی دہشت! لباس کی وہ لمبی نالی جو سانس لینے کا ذریعہ ہوتی ہے، باب الموت کے باہر نواب الیاس کی نگرانی میں چھوڑ دی گئی۔ اور میں باہر کی تازہ نسیم کے زندگی بخش سانس لیتا ہوا اپنے بوجھل لباس میں آہستہ آہستہ باب الموت کی خوفناک سرزمین کے اندر چلا گیا۔ البتہ کتے بغیر کسی قسم کی سانس کی نالی یا لباس کے میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ بیس منٹ کے بعد ہی ایک کتے کی چال کچھ لڑکھڑا سی گئی۔ دوسرا بھی سست معلوم ہونے لگا۔ بیس منٹ بعد نواب الیاس نے حسبِ ہدایات زور کی سیٹی بجائی جسے سُن کر کتوں نے اپنا رُخ بدل دیا اور جنگل سے باہر جانے کی کوشش کرنے لگے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میرے ساتھ اور بھی کتے تھے۔ میری نگاہ انہیں کتوں پر لگی تھی، کچھ دیر بعد ان کتوں پر بھی وہی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ جب ایک کتے کو چکر آنے شروع ہوئے اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا، تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں اپنے تجربے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ میں نے جھک کر

اس کا معائنہ کیا۔ وہ سانس لینے [illegible] رہا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوا۔ گویا کیباپورت کے آسیب نے معصوم کتّے کو بھی نہ چھوڑا۔ برخلاف اس کے مجھ پر نہ کسی سحر کا اثر تھا نہ جادو کا۔ چند منٹوں بعد دوسرے دو کتّے بھی ختم ہو گئے۔ میں نے ایک موم بتی جلائی۔ مگر فوراً ہی وہ بجھ گئی۔ حالانکہ بجھانے والے کی شکل نظر آ رہی تھی۔"

مَیں نے حیران ہو کر کہا "کسی بھوت نے بجھائی تھی؟"

"کیا معلوم،" ڈاکٹر گار ہنس پڑا۔ "مَیں نے کئی دفعہ موم بتی روشن کی اور وہ خود بخود بجھ گئی۔ موم بتی کے تجربے نے مجھے اور بھی مطمئن کر دیا۔ بیٹی رو دی۔ اگرچہ مجھے کتّوں کی موت، اپنی زندگی اور موم بتی کے خود بخود بجھنے سے کامیابی کی پوری اُمید تھی، اس کے باوجود وہاں کے جنگلوں کی سائیں سائیں اور تنہائی سے کلیجہ کانپ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اتنی دُور پہنچ گیا، جہاں کوئی سیاح اب تک نہیں پہنچ سکا، اور جہاں پہنچنے کی تمنا میں سینکڑوں بندگانِ خدا نے اپنی جانیں تلف کر دیں۔ وہاں نہ کوئی آسیب تھا نہ کوئی جادوگر، البتہ انسانی ہڈیاں اور گلے سڑے گوشت کے ٹکڑے نظر آ جاتے تھے۔ گویا موت ہر قدم پر موجود تھی! —— اور زندگی کا کہیں نشان نہ ملتا تھا آخر مَیں آسیبِ اجل کو دھوکا دے کر واپس آنے لگا! کامیاب! اپنی فیروزمندی پر نازاں! نہایت بشاش!"

ہم لوگ انتہائی اشتیاق اور اضطراب سے اُس کی حیرت انگیز داستان سننے

رہے۔ نتیجے کو معلوم کرنے کے شوق میں پاگل ہو رہے تھے۔ سر ہارلی جھلا کر بولے "پھر آخر راز کیا تھا؟ لوگ کس چیز کو آسیب کہتے تھے، کہہ بھی ڈالو۔"

ڈاکٹر گار اُن کی بے چینی پر ہنس پڑا۔ بولا "سننا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر نسوار کی ڈبیا کھول لی۔

مجھے شدید غصہ آیا۔ "کیا واہیات ہے ڈاکٹر۔ پہلے کہہ ڈالو۔ وہاں کا بھوت آخر تھا کون؟"

چچا الیاس ہنس پڑے۔ بولے "بھوت کا نام بھی بتا دیجیے نا!"

ڈاکٹر گار نسوار کی چٹکی بھر کر بولا "سننا چاہتی ہو بیٹی رُوحی؟"

مَیں نے جھنجھلا کر کہا "یہ وقت مذاق کا ہے؟"

"کیا کرو گی سن کر" ڈاکٹر مسکرایا۔ پھر ہمارے اضطرار اور غصّہ کو دیکھ کر کہنے لگا۔ "اُس بھوت کا نام "کاربانک اکسائیڈ" ہے۔"

"گیس!" سر ہارلی یک لخت بول پڑے۔

گار کہنے لگا "ہاں گیس۔ کاربانک اکسائیڈ جو ایک زہریلی گیس ہوتی ہے انسانی زندگی کی دشمن ہے۔ مَیں نے شہزادی عائشہ کا بیان سن کر اور پھر کتوں پر تجربہ کر کے ہی پہچان لیا تھا کہ ان جنگلوں کا راز کیا ہے۔ پھر موم بتی کے شعلہ کو خود بخود بجھتا ہوا دیکھ کر میرا یقین پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اِن پرانے دلدلوں سے دن رات وہ زہریلی گیس اُٹھتی رہتی ہے،

اور جو سیاح اندر جاتا ہے اُسے پُراسرار طریق پر گلا گھونٹ کر ختم کر دیتی ہے۔ کوئی شے نظر نہیں آتی، اور گیس کی طرف کسی کا خیال نہیں جاتا۔ ادھر سیاحوں کے دماغ پر آسیب اور سحر کا خیال ایسا مسلط ہوتا ہے کہ وُہ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں، اسے شیطانی کرشمہ سمجھتے ہیں اور اس آسیبی کرشمے کے راز کو معلوم کرنے کے اشتیاق میں پاگلوں کی طرح اندر بہت دُور چلے جاتے ہیں، جب گیس کا اثر ان پر شروع ہوتا ہے، اور دوران سر میں مبتلا ہوتے ہیں تو واپس آنا چاہتے ہیں۔ لیکن گیس سے زیادہ متاثر ہونے کی وجہ ان میں طاقت نہیں ہوتی۔ غنودگی طاری ہونے لگتی ہے، اور گر پڑتے اور وہیں ختم ہو جاتے ہیں۔ لوگ اسے آسیبی موت کہتے ہیں! وُہ تو بڑے شکر کا مقام ہے کہ شہ عائشہ ایک لاش کی اُنگلی میں انگشتری دیکھ کر ابتدائی منازل پر رہ گئیں زیادہ اندر نہ گئیں

یا خدا!! یہ تھا راز کیمیا بوت کے آسیب زدہ جنگلوں کا! لیکن کتنا خوفناک اور ہلاکت آفریں!

باقی دن کیسا گزرا؟ —— اخبار کے نمائندوں کا ایک تانتا لگ گیا۔ بچا الیاس ڈاکٹر گار کا ناک میں دم تھا۔ کوئی بیان لے رہا تھا۔ کوئی تصاویر اُتار رہا تھا۔ اور اُ کی تصویریں ہر پہلو سے اُتاری گئیں۔ ایک تصویر تو ایسی تھی جو مجھے اب تک یاد ہے اور جو آج تک میرے کتب خانے میں لکھنے کی میز پر رکھی ہے۔ وُہ ڈاکٹر گار کی تصویر خانہ بدوشوں نے اُسے اپنے کندھے پر اُٹھا رکھا ہے اور وہ قہقہہ مار کر ہنس رہا ہے۔